عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم

طلوعِ اسلام

اپریل ۱۹۴۸

ایک روپیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

دورِ ثانی

مرتب
محمد یونس

بدلِ اشتراک
سالانہ — دس روپے
ششماہی — چھ روپے

جلد ۱	قیمت فی پرچہ	ایک روپیہ	نمبر ۴

فہرست مشمولات

۱۳ اپریل کی یاد میں	۱
لمعات	از ۳ تا ۸ - بقیہ ۹۷
مجاہدین کا کیمپ	۹
حکومت کو یاددہانی	۱۶
وراثتِ ارض کا ابدی قانون (جناب پرویز)	۱۷
تقسیمِ ہند کا آئینی پہلو (۴)	۴۹
خشم نگر	۵۳
قرآنی تعلیم (علامہ اسلم جیراجپوری)	۷۳
اقبال اکادمی	۷۹
ترانۂ پاکستان	۸۴
پاکستانی اچھوت	۸۸
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی	۸۹
بقیہ لمعات	۹۷ تا ۱۰۰

۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کی یاد میں

سرودے رفتہ باز آید نیاید
نسیمے از حجاز آید نیاید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید نیاید

بانیٔ تصورِ پاکستان، مفکرِ اسلام، ترجمان القرآن

حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ

لمعات

بدل کے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

سابقہ اشاعت میں ہم نے "محاسبۂ نفس" کے زیرِ عنوان، ضمناً یہ بھی لکھا تھا کہ نیشنلسٹ مسلمان کس طرح خاموشی سے نظم و نسق حکومت میں دخیل ہو رہے ہیں اور اس طرح مملکت پاکستان کے لئے ایک مستقل خطرہ کا موجب بن رہے ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جو زیرِ نقاب اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف کار ہے۔ لیکن ان ہی کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ایک دوسری شکل میں پاکستان کی تخریب کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ اس گروہ کا سرخیل، سرحدی گاندھی عبدالغفار خان ہے۔ یہ خان صاحب جب مجلس دستور ساز پاکستان کے اجلاس میں شمولیت کے لئے عازمِ کراچی ہونے والے تھے تو ہمارا ماتھا ٹھنکا تھا کہ معلوم اب یہ مسلمانوں کے لئے کیا نئی مصیبت پیدا کریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے یہاں پہنچ کر سب سے پہلے تو اسی "پٹھانستان" کا مطالبہ پیش کیا جسے ہندو کی اسلام دشمنی نے تقسیمِ ہند سے پہلے تشکیلِ پاکستان کی راہ میں ایک سنگِ گراں کی حیثیت اختیار کرنے کے لئے وضع کیا تھا اور جسے، ریفرنڈم کے موقعہ پر مسلمانانِ سرحد میں تشتت و افتراق پیدا کرنے کے لئے بطور آلۂ حرب استعمال کیا تھا۔ اس وقت یہ آلۂ حرب جس قدر ناکام ثابت ہوا اس کے پیشِ نظر بجا خیال تھا کہ سرحدی گاندھی صاحب اسے دوبارہ میدانِ جنگ میں نہیں لائیں گے۔ لیکن وہ اپنی بندوق میں جہاں ایک تازہ کارتوس لائے (جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا) اس پہلے ہوئے کارتوس کو بھی ساتھ اٹھا لائے کہ شاید کوئی سادہ لوح اس کا بھی شکار ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس مطالبہ کو اسمبلی میں پیش کیا اور اس کے حق میں یہ دلیل دی کہ:

ہم، تمام پٹھانوں کے لئے، پاکستان میں ایک خود مختار علاقہ چاہتے ہیں۔ میرا مطالبہ وہی ہے جو اسلام کا مطالبہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ڈیورینڈ لائن سے مشرق کی طرف تمام پٹھان متحد ہو جائیں اور اس مقصد کے لئے ہم آپ کی امداد کے خواہاں ہیں۔

(ہندوستان ٹائمز۔ ۶ مئی)

یعنی ایک خود مختار ریاست کی تشکیل کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور اس کا مقصد بتایا جاتا ہے پٹھانوں کا اتحاد! پھر تماشا یہ کہ اس اتحاد کو جس کی بنا خالص نسل پرستی پر استوار ہے، اسلام کا مطالبہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اسلام بیچارہ بھی دنیا میں کس قدر مظلوم ہے۔ جو الزام کسی کے جی میں آئے اس کے سر تھوپ دے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں

لیکن، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ کارتوس چلا ہوا تھا، اس لئے مؤثر ثابت نہ ہوا۔ لہٰذا اس کے بعد سرحدی گاندھی صاحب نے دوسری لبلبی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کے لئے انہوں نے پہلے یوں زمین تیار کی۔

ہمیں یہاں خلفائے راشدین کے انداز پر حکومت قائم کرنی چاہیئے۔ لیکن اس کے لئے قربانی کی ضرورت ہوگی۔ ہمیں پاکستان میں اس اقتصادی اور سیاسی مساوات کو قائم کرنا چاہیئے جس کا حکم قرآن دیتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں کوئی فرقہ وارانہ آرگنائزیشن نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ پاکستان ایک آزاد مملکت ہو جس کا نظم و نسق عوام کے ہاتھوں میں ہو (اربابِ حکومت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا) تم لوگوں کو عوام کا خادم ہونا چاہیئے۔ پاکستان کس کا ہے؟ یہ ہمارا ہے۔ پاکستان ایک غریب ملک ہے۔ اس کا نظم و نسق امیرانہ ٹھاٹھ سے نہیں ہونا چاہیئے۔

وہی قرآن اور قرآنی حکومت کے دعاوی جسے ہر شخص اپنے اپنے مقاصد و مصالح کیلئے بیدریغ استعمال کر رہا ہے۔ وہی غریبوں کے مصائب و آلام کا ذکر جس سے ہر سرمایہ دار کا سینہ فگار دکھائی دے رہا ہے وہی ابلہ فریبی کہ جس سے آج اشتراکیت کے نقاب میں ہر جگہ بے آئینی پھیلائی جا رہی ہے سرحدی

سازشوں کو کامیاب بنانے میں ان تھک کوشش کریں گے۔ اس لئے بھی نہیں کہ ان کے استیصال کے لئے جس آہنی گرفت کی تجویز ہم نے پیش کی ہے وہ خلاف مصلحت ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر یہ تحریکیں کامیاب نہیں ہوں گی۔ یہ کامیاب ہوں گی اس لئے کہ ہمارے ارباب اقتدار و حکومت نے کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ وہ آسمان سطوت و ثروت کی بلندیوں سے نیچے اتر کر کبھی بیچارے زمین والوں کی بھی بات سن لیں۔ ہم نے گذشتہ اشاعت میں بھی گزارش کیا تھا۔ اور اشاعت زیر نظر میں نظریہ کوہکن کے عنوان میں، اس گذارش کو پھر دہرانے کی جرأت کی ہے کہ حکومت اور ملت میں ایک خلا پیدا ہو چکا ہے جسے باہمی روابط سے پُر کرنے کی بڑی سخت اور بہت جلد ضرورت ہے۔ ملت حکومت کو اپنے میں سے نہیں سمجھ رہی۔ اس لئے کہ ارباب حکومت نے کبھی انہیں سمجھانے کی کوشش نہیں کی کہ حکومت ملت کی ہے اور وہ ملت ہی کی خاطر نظم و نسق حکومت سرانجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی رفتار و گفتار میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی۔ انہوں نے کبھی اس کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ وہ اتنا دریافت ہی کر لیں کہ غریبوں پر کیا گذر رہی ہے؛ انہیں کن مشکلات کا سامنا ہے؟ وہ کس طرح اپنے دن کاٹ رہے ہیں! یہ کبھی ان کی حالت جا کر دیکھیں تو انہیں معلوم ہو کہ اُن کے بچوں کو وہ کچھ نہیں ملتا جو ان کے کتوں کو ملتا ہے۔ اُن کے اور ان کے معیار زندگی میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ اُن کے سامان زیست اور ان کے اثاثۂ حیات میں کوئی قدر مشترک ہی نہیں۔ اگر ہم عوام کے احساسات و جذبات اور امیال و عواطف کے مطالعہ کرنے میں غلطی نہیں کر رہے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ عوام کے دلوں سے ارباب حکومت کا اعتماد اٹھتا جا رہا ہے۔ اور حکومتیں صرف اعتماد کے زور پر چلا کرتی ہیں نہ کہ پولیس اور فوج کے بل بوتے پر۔

بملازمان سلطاں، خبرے دہم زرازے
کہ جہاں تواں گرفتن، بنوائے دل گدازے

تخریبی قوتیں، اسی بُعد اور خلا سے فائدہ اٹھائیں گی جو قوم اور حکومت کے درمیان پیدا ہو رہا ہے اور جسے پُر کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جا رہی۔ وہ اس بد اعتمادی کو اپنے کام میں لا رہی ہیں

جو احترام و عقیدت کی بجائے عوام کے دلوں میں گھر کئے جا رہی ہے۔ وہ ان راہوں سے قصرِ پاکستان کی بنیادوں تک جا پہنچیں گی اور پھر ان کا ازالہ نہ کوئی آہنی گرفت کر سکے گی نہ تعیش شدید۔ ان کا علاج سب سے پہلے خود ہمارے ارباب حل و عقد کی زندگی کی تبدیلی میں مضمر ہے اور اس کے بعد، شورش پسند، شر انگیز، تخریبی قوتوں کے استیصال میں۔ ان ہی دونوں کے مجموعہ کو قرآن و شمشیر کا ماحصل کہتے ہیں۔ اور

این دو قوت حافظ یکدیگر اند
کائناتِ زندگی را محور اند

---

۱۰ مارچ کو مدراس میں، مسلم لیگ کی ہندوستانی شاخ کا جلسہ ہوا جس میں ۴۷۷ اراکین میں سے صرف ۳۰۰ شریک ہوئے۔ صرف اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں آج کل بچارے مسلمانوں پر کیا گذر رہی ہے۔ لیگ مسلمانوں کی محبوب ترین جماعت تھی۔ لیکن وہاں کی حکومت مسلمانوں کے خلاف جس انتقامی جذبہ سے کام لے رہی ہے اس کا نتیجہ ہے کہ مسلمان لیگ کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار تک بھی نہیں کر سکتے۔ ہم نے گذشتہ اشاعت میں لکھا تھا کہ ہندوستان میں راشٹریہ سیوک سنگھ اور مہاسبھا کے خلاف جو پکڑ دھکڑ شروع ہوئی ہے وہ محض دکھاوے کی ہے اور اس سے مقصد فقط اس قدر ہے کہ اس آڑ میں مسلم لیگ اور اس سے متعلقہ اداروں کو تخویف و ترہیب سے کچل ڈالا جائے۔ اس کی تائید اب خود وہاں سے ہونے لگی ہے۔ چنانچہ ٹائمز آف انڈیا، اپنی ۱۰ مارچ کی اشاعت کے ثانوی مقالۂ افتتاحیہ میں لکھتا ہے کہ:

> جس سختی سے مرکزی اور صوبوں کی حکومتوں نے "ہندو فرقہ داری" کے خلاف کارروائی کی ہے اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مسلم لیگ کا متین طبقہ یہی مناسب سمجھتا کہ اب ہندوستان میں مسلم لیگ کو ختم کر کے کانگریس کی قومیت کو تقویت پہنچائی جائے۔۔۔۔۔۔ ہندوستان

ربانی لمعات صفحہ ۹ پہ ملاحظہ

مجاہدین کا کیمپ

(وہ دنیا جہاں ایمان عمل میں متشکل ہوتے ہیں)

محاذ کشمیر کے سلسلہ میں، شمال مغربی سلسلۂ کوہ سے آنے والے فاتحین، رضاکاران اور مجاہدین کے متعلق میں اکثر قصے کہانیاں سنتا آرہا تھا جن کی وجہ سے ان عجیب و غریب لوگوں سے ملنے کا شوق دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ لیکن ان آہنی مجاہدین کے مسکن کی تلاش اور پھر اس تک رسائی، جوئے شیر سے کم نہ تھا۔ بارے اس باب میں میری مساعی کامیاب ہوگئیں اور بالآخر وہ دن آگیا کہ میں ان کے کیمپ کے بیرونی حدود کے قریب جا پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی درشت پشتو کے ان الفاظ نے میرا استقبال کیا۔

کون؟ جہاں ہو وہیں رُک جاؤ!

اور اس آواز کے ساتھ ہی ایک آہنی پیکر میرے سامنے کھڑا تھا۔ ایک دیو ہیکل جوان جس کی بندوق کی نالی کا منہ عین میرے دل پر تھا۔

میں اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا تھا اور میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ سنتری آگے بڑھا اور اپنی فولادی انگلیوں سے میرے سینہ کو ٹھونکتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔

دوست یا دشمن؟

میرے دل کی دھڑکن غیر معمولی طور پر تیز ہوگئی اور میں بھرائی ہوئی آواز سے بمشکل اتنا کہہ سکا۔

دوست، نہیں بلکہ بھائی!

تم یہاں کیوں آئے ہو؟ یہ دوسرا سوال تھا جو مجھ سے کیا گیا۔

"سالار اعلیٰ سے ملنے" اُسے ایک خط دیتے ہوئے میں نے جواب دیا۔

وہ گرج کر بولا — ناک کی سیدھ چلے جاؤ۔ اگر تم نے اِدھر اُدھر دیکھا تو وہیں ڈھیر کر دیئے جاؤ گے

میں بمشکل پچاس قدم آگے بڑھا ہونگا کہ تنومند، قوی ہیکل، تندخو، بندوقچیوں کا ایک دستہ میرے سامنے آیا۔ میں ابھی اپنا مطلب بھی پوری طرح بیان نہ کرنے پایا تھا کہ ایک شخص نے آگے بڑھ کر ایک بڑی سی ٹوپی سے میرے سر اور چہرے کو ڈھانپ دیا۔ اس کے بعد میری تلاشی لی گئی اور پھر مجھے اٹھا کر اتنے چکر دیئے کہ میرے حواس گم ہو گئے۔ اس کے بعد مجھے پہاڑیوں کے اوپر اور وادیوں کے اندر گھماتے گھماتے ایک سخت سے قطعۂ زمین پر لا کر ڈال دیا۔ اور میری ٹوپی اتار دی گئی۔ میری آنکھیں کھلیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے گرد و پیش، سرو قد، عظیم الجثہ، زندگی کے جوش اور ولولہ سے بھرے ہوئے نوجوان، پیرانہ سال، آفریدیوں، مہمندوں، وزیریوں اور محسودوں کا ایک بپھرا ہوا سیلاب متلاطم ہے۔ تمام کے تمام خنجروں، چاقوؤں پستولوں، اور رائفلوں، بلکہ ان سے بھی زیادہ تند و تیز اور مہیب و خطرناک ہتھیاروں سے مسلح۔ ان کی گفتگو، آنے والی جنگ اور جنگ کی خوں ریزی، انتقام اور کامرانی، کارہائے نمایاں، اور فتوحاتِ درخشاں، کی یاد اور ضائع شدہ مواقع کی بازیابی کی تمناؤں پر مشتمل تھی۔ باتیں ہو رہی تھیں اور مجاہدین قطار در قطار، آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ حتیٰ کہ وہ تمام سیدان انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بن گیا جو ادنیٰ سے اشارہ پر حدود ساحل توڑ کر، ساری دنیا پر چھا جانے کے لئے مضطرب بیتاب نظر آتا تھا۔

اتنے میں دور سے بگل کی آواز آئی جس کے سنتے ہی یہ تمام پُرشور سمندر، تاروں بھرے آسمان کی سی خاموشی میں تبدیل ہو گیا۔ اب وہ مضطرب و بے قرار، پر جوش و خروش انسان نہیں، پتھر کے بے حس و حرکت مجسمے نظر آتے تھے۔ ساکت و صامت یہ سب کے سب، قطار در قطار، ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ اتنے میں کھانا آگیا۔ ایک موٹی سی روٹی۔ بھنے ہوئے گوشت کا ایک تکا اور شوربے کا پیالہ۔ بس یہ تھا ان کا الوداعی کھانا۔ کھانا کھا چکے تو سب کے سب اللہ

کے حضور، نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ وہ آہنی برگ دبنر، کے متعلق بھی، ... پھر نہیں ہو سکتا تھا

سامنے جھکیں گی۔ زمیں بوس تھیں۔ نماز سے فارغ ہوئے تو پھر بگل کی آواز
نکل گئی۔ اب یہ سب کے سب خاموش کھڑے تھے۔ ان کی صفیں شانوں سے شانے
رنوسوں کی بیٹیوں سے ڈھکے ہوئے۔ عزم و استقامت کے یہ آہنی پیکر
۔

آواز مدھم پڑی تو ہر طرف سکوت تھا۔ کامل سکوت — جب ایک دراز قامت
ب خاتون کی آواز نے توڑا جس میں مردانہ شکوہ و جلال بھرا ہوا تھا — یہ
— ماؤں بہنوں اور بیٹیوں — کے ایک اجتماع عظیم میں کھڑی تھی، جو اپنے
باپ، خاوند اور بھائیوں — کو الوداع کہنے کے لئے جمع ہوئی تھیں۔
ون نے ان مجاہدین کو مخاطب کر کے کہا۔

تم جا رہے ہو! لیکن جانے سے پہلے میری بات سنتے جاؤ
میں تمہارے لئے ایک پیغام لائی ہوں — یہ پیغام ہر ماں
ہر بیوی، ہر بہن اور ہر بیٹی کی طرف سے ہے۔
ہونٹوں کی سرخی اور رخسار کا غازہ عورتوں کی زینت ہے لیکن
مردوں کے ہاتھ کی زینت، دشمن کا رنگین لہو ہے۔
گر تم فاتح و منصور واپس آئے تو ہمارے دلوں پر حکومت کرو گے۔
گر تم میدانِ جہاد میں شہید ہو گئے تو ہم اپنے آنسوؤں سے تمہاری
یاد منائیں گی۔
لیکن اگر تم دشمن کو پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے تو یاد رکھو۔ تم ہماری
لاشوں کو روند کر ہی گھروں میں داخل ہو سکو گے۔

سن لیا — اچھا خدا حافظ — جاؤ!

کہ دنیا میں کسی
فضا کو چیرتی ہو
ہوئیں سینے
سامنے کھڑے
بگل کی
سن رسیدہ عفت
خاتون، مستورات
مردوں — لیے
اس خا

اس پیغام کے بعد، وہ خاتونِ محترم، معہ تمام بچیوں اور عورتوں کے، چٹانوں کے پیچھے اوجھل ہو گئی لیکن سننے والوں میں سے کسی نے ایک لفظ بھی جواب میں نہ کہا۔ جواب دیا تو ان کی شعلہ بار رائفلوں کے دہانوں نے جن کی کڑکتی ہوئی بجلیوں نے ساری فضا کو اس حقیقت پر گواہ بنا لیا کہ۔ سمعنا و اطعنا۔ ہم نے سن لیا۔ خدا نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔ وہ الفاظ میں جواب دینا نہیں جانتے تھے۔ صرف اعمال و کردار سے جواب دینا جانتے تھے۔ موت ان کے لئے کسی ڈر کا سامان اپنے اندر نہیں رکھتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اسے کس طرح جھانسا دیا جا سکتا ہے۔

مجاہدین گروہوں میں بٹ گئے اور دیوانہ وار رقص کرنے لگ گئے ــ موت کی تمنا میں رقص ــ رقص کرتے اور گاتے۔ نعرے بلند کرتے اور حلف اٹھاتے۔ حلف اٹھاتے اور چکر لگاتے اور اس طرح موت کو پیچھے دھکیلتے، زندگی اور اس کی گرم جوشیوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ نقارہ کی آواز نے اس جوش و رقص کو پھر سکوت و خاموشی میں تبدیل کر دیا۔

"اے موت کے پیغامبرو!" ایک کرخت آواز نے نہایت تحکمانہ انداز سے کہا۔

جاؤ ــ اور جہاں جاؤ موت کا پیغام اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔

موت کا پیغام ان کے لئے جن کی ستم رانیوں نے بے گناہوں کا خون بہایا ہے۔

دخترانِ اسلام کی عصمت دری کی ہے

اللہ کی مساجد کی بے حرمتی ہوئی ہے۔

کیا اب بھی تم دینِ خداوندی کی عزت بچانے کے لئے تلوار نہیں اٹھاؤ گے؟

تمہیں فیصلہ کرنا ہے کہ تمہاری راہ بتیل کی ہے یا محمدؐ کی۔

کیا تم نے اپنی راہ پہلے ہی منتخب نہیں کر رکھی؟

تمہاری ماؤں نے تمہیں اسی دن کے لئے جنا تھا۔

خدا کی قسم! جس خدا نے تمہارے ساتھ اپنے وعدوں میں کبھی خیانت نہیں کی۔ اگر تم نے

اس کے ساتھ خیانت کی تو تمہیں دنیا میں سر چھپانے کو کہیں جگہ نہ مل سکیگی۔

جاؤ ___ اور دیکھو کہ دشمن کی تعداد یا اس کی قوت تمہیں مرعوب نہ کر دے۔ اس لئے

کہ تمام قوتوں کی مالک صرف خدا کی ذات ہے۔

خدائے رحمان کی بشارات دینے والے فرشتے، تمہارے قلب و دماغ اور دست

و بازوؤں کو صراط مستقیم پر رکھیں۔

دیکھنا ___ عورتوں اور بچوں پر کبھی ہاتھ نہ اٹھانا۔ اپاہجوں اور نہتوں کو کبھی نہ چھیڑنا

لیکن کسی ڈوگرہ اور سکھ کو کبھی نہ چھوڑنا ___ ان سے شمشیر آتش کی زبان

میں گفتگو کرنا کہ وہ اس کے سوا کوئی دوسری زبان سمجھ ہی نہیں سکتے۔

جاؤ میرے بچو! اللہ کی نصرت تمہارے ساتھ ہو۔

اللہ اکبر!

اس کے ساتھ ہی اردگرد کی پہاڑیاں "اللہ اکبر" کے نعروں سے گونج اٹھیں اور گولیوں کی آواز نے فضا کو مرتعش کر دیا۔ اور یہ کاروانِ عمل و حرکت پہاڑ کے دامن میں اترتا چلا گیا۔

میں اس کیفیت سے سرشار، اپنے خیالات میں مستغرق کھڑا تھا جو ایک دوستانہ ہاتھ نے میرے کندھے کو جنبش دی اور ایک رافت آمیز آواز نے مجھ سے پوچھا ___ کیوں بھائی آپ کا جی گھبر گیا؟

میں اپنے گہرے خیالات سے یک لخت چونکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے ایک سن رسیدہ، بارعب، واجب الاحترام شخصیت موجود ہے جس کے نورانی چہرے پر مشفقانہ تبسم رقص کناں ہے۔ میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا ___ جناب سالارِ اعلیٰ سے تو ابھی تک مجھے شرف ملاقات حاصل ہی نہیں ہوا"!

"سالارِ اعلیٰ میں ہی ہوں" ___ مجھے جواب ملا۔

میں فرطِ تعظیم سے جھک گیا۔ پھر عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو ایک دو سوال پوچھ لوں!

جتنے جی چاہے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ جتنے کم سوال پوچھیں گے اتنا ہی اچھا ہوگا۔ کیونکہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ہم سب اس وقت میدانِ کارزار میں ہیں۔ ہم سب۔ گہواروں میں ہمارے بچے تک بھی۔ بلکہ قبروں میں ہمارے مردے تک بھی۔ ہم سب کے سب میدان کارزار میں ہیں۔ نازک ترین گھڑی ہمارے سروں پر آپہنچی ہے۔ اب اس قدر وقت ہے نہیں کہ اسے باتوں میں ضائع کیا جا سکے۔ اسلام خطرے میں ہے۔ اس وقت محض کشمیر کا سوال نہیں بلکہ اس وادی میں جو معرکہ درپیش ہے اُس کے ساتھ محمدؐ پاک کی عزت کا سوال بھی وابستہ ہے۔

محمدؐ پاک کی عزت کا سوال!

ہماری منزل کٹھن ہے اور راہ دشوار۔ لیکن منزل بالکل واضح ہے۔ دشمن ہماری پہاڑیوں اور ہمارے گھروں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے تاکہ ہمیں بموں اور سنگینوں کے زور پر اطاعت کے لئے مجبور کر دے اور برطانیہ اور روس کی جنگ میں ہمیں روس کی توپوں کا چارہ بنایا جائے۔ لیکن قسم ہے خدائے پاک کی۔ ہم انگریز اور ہندو ملوکیت کے بھاڑے کے ٹٹو بن کر کسی ملک یا کسی نظریہ کے خلاف جنگ نہیں کریں گے۔

ہم رسولِ پاکؐ کے سوائے کسی اور کی اطاعت کو نہیں جانتے۔ ہم اسی کے دامن سے وابستہ ہیں اور اس کے دامن کی حفاظت کے لئے اپنی جان تک قربان کر دیں گے۔ انگریز نے گذشتہ سو برس میں ہمارے خلاف ۲۷ چڑھائیاں کیں لیکن اس کے باوجود ہماری روح کو محکوم نہ کر سکا۔ اب یہ ۲۷ ویں اور آخری یورش ہندوؤں کے زیر سرپرستی کی جا رہی ہے۔ اس کا انجام بھی دشمن کے لئے ناکامی اور نامرادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ لیکن اس کے لئے ہمیں اپنی پوری

نہیں۔ نہ ہی ہمیں ان کا پتہ معلوم ہو سکا ہے۔ بہرحال وہ جہاں بھی ہوں، اُن تک ہمارا سلام پہنچے اور ہمارے دل درد آگیں کی مخلص دعائیں کہ اللہ ان کا اور ان کے رفقائے عمل اور جملہ مجاہدین کا حافظ و ناصر ہو اور وہ سب کامیاب و کامراں فاتح و منصور واپس لوٹیں اور اس طرح انہیں دنیا اور آخرت کی سرفرازیاں حاصل ہوں

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمیں باد

مدیر طلوع اسلام]

۲۱ر اپریل کو

حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کا یوم وفات ہے۔ ہم نے سابقہ اشاعت میں ارباب حکومت کی توجہ ان کی اس فروگذاشت کی طرف منعطف کرائی تھی جو ان سے بانیٔ تصور پاکستان کی یاد نہ منانے کے سلسلہ میں ہوئی ہے۔ ہم نے گذارش کیا تھا کہ

(۱) ۲۱ر اپریل کو عام تعطیل کی جائے۔

(۲) اور اس تقریب کو منانے کیلئے حکومت کی طرف سے خاص طور پر اہتمام کیا جائے۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس وقت تک آثار سے کہیں پتہ نہیں چلا کہ حکومت نے اپنی اس فروگذاشت کا احساس کیا ہے اور انہیں اس کی تلافی کی فکر ہوئی ہے۔ لیکن چونکہ ۲۱ر اپریل میں ابھی وقت باقی ہے اس لئے ہم نے ابھی تک امید نہیں توڑی۔ خدا کرے پاکستان کی حکومت اس درجہ احسان ناشناس ثابت نہ ہو، کہ اپنے اس عظیم القدر محسن کی یاد تک نہ منائے۔

قوم بیتابی سے حکومت کے اقدام کی منتظر ہے۔

وراثت ارض کا ابدی قانون

پرویز

نظام کائنات ایک معینہ قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ ایک چھوٹے سے چھوٹے ذرہ خاک سے لے کر بڑے سے بڑے کرہ سماوی تک ہر شے زندانی تقدیر ہے۔ آفتاب جہانتاب ایک مقررہ قاعدہ کے مطابق ہر صبح دریچۂ مشرق سے جھانکتا ہے اور ایک متعینہ شاہراہ پر چل کر ہر شام حجلۂ مغرب میں روپوش ہو جاتا ہے۔ اس کے دورانِ سفر میں ہر شے جس میں زندگی کی صلاحیت ہوتی ہے، اس کے نور و حرارت سے اپنے سینے کو بھرپور کر لیتی ہے۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (۳۶/۳۸) چاند ایک خاص قاعدہ کے مطابق، ایک غوطہ خور کشتی سیمیں کی طرح دریائے نیل سے ابھرتا ہے اور ایک خاص نظام کے تابع پھیلتا اور سمٹتا، پھر کسی کی تلاش میں گم ہو جاتا ہے۔ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ (۳۶/۳۹) جب خزاں کی دست درازیاں صحن گلستاں سے شگفتگی و شادابی کے تمام آثار و مظاہر کو، مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے متاعِ حیات کی طرح ختم کر دیتی ہیں تو فطرت کے ایک معینہ قاعدے کے مطابق، نسیم بہار، مسرتوں اور شادمانیوں کی ایک رنگین و عطر آگیں دنیا اپنے جلو میں لئے آتی ہے، اور زمین کے حسرت زدہ، غم آلود چہرے کو پھر تبسم فشاں و قہقہہ بار بنا دیتی ہے۔ وَكَذَٰلِكَ اللَّهُ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنَّاتٍ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ وَفَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُونِ (۳۶/۳۴)

پھر جس طرح یہ قوانین و ضوابط خارجی دنیا میں جاری و ساری ہیں اسی طرح انسان کی

داخلی دنیا میں بھی ان کی حکمرانی ہے۔ اور جس طرح انسان کی انفرادی زندگی کی جوئے رواں ان ہی سواحل میں محصور ہے اسی طرح اس کی حیاتِ اجتماعیہ کا یمِ بیکراں بھی ان ہی حدود و ثغور میں مقید ہے ... ... انسان کی حیثیتِ اجتماعیہ میں سب سے اہم شعبہ نظامِ حکومت اور آئینِ مملکت ہے۔ جسے قرآن "وراثتِ ارض" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ حکومت کیسے ملتی ہے اور کس طرح ملتی ہے۔ اور پھر کس سے چھنتی ہے اور کیوں چھنتی ہے؟ اس کے لئے بھی خدا کا ایک ابدی قانون معین ہے اور وہ قانون، قرآن کے ان الفاظ میں مشہود ہے جو سورۂ انبیاء میں یوں مرقوم ہیں۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۝ إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِقَوْمٍ عَابِدِينَ ۝ (۲۱ / ۱۰۵-۱۰۶)

اور ہم نے تورات کے بعد زبور میں (بھی) اس حقیقت کو لکھ دیا تھا کہ زمین کی وراثت ہمارے صالح بندوں کے لئے مقدر ہے (اس عظیم الشان قانونِ خداوندی میں) عبودیت اختیار کرنے والی قوم کے لئے ایک عظیم القدر (بصیرت افروز و حقیقت کشا) پیغام ہے۔

امانتِ حکومت و مملکت کی تفویض اور متاعِ جہانداری و جہانبانی کی وراثت کے متعلق یہ وہ قانونِ ابدی اور اصولِ سرمدی ہے جس کا نوشتۂ خداوندی کی حیثیت سے اعلان کیا گیا ہے اور اس میں قوموں کے عروج و زوال اور امتوں کے استخلاف و استبدال کے متعلق ایک ایسے بنیادی معیار کا ذکر کیا گیا ہے جس میں ہر صاحبِ بصیرت کے لئے پیغامِ عظیم اور بلاغِ مبین مضمر ہے۔ یہ بنیادی اصول کیا ہے؟ بس یہی کہ وراثتِ ارض کے لئے صلاحیت (یا صالحیت) شرط ہے۔ یعنی وہی قانون جو عالمِ آفاق میں بقاءِ اصلح کے محکم اصول کی حیثیت سے جاری و ساری ہے۔

"صلاح" دیکھنے کو تو چار حروف کا ایک مختصر سا لفظ ہے لیکن اپنی جامعیت کے اعتبار سے ایسا ہمہ گیر ہے کہ اس میں کائنات کے چاروں گوشے سمٹ کر آگئے ہیں۔ صالح کے معنی ہیں صحیح و سالم، تندرست، توانا، مستوی الجسم اور متناسب الاعضاء، زندگی کی تمام صلاحیتوں کو

لئے ہوئے ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں ہے کہ جنین کی پیدائش سے پہلے، میاں بیوی دونوں خدا سے دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ (خدایا! ہمیں صحیح وسالم، تندرست و توانا بچہ عطا کر دے تاکہ ہم تیرے شکر گذار بنیں۔ ۷/۱۸۹) فَلَمَّآ اٰتٰھُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَہٗ شُرَکَآءَ فِیْمَآ (لیکن جب اللہ انہیں تندرست و توانا بچہ عنایت کر دیتا ہے تو اس بارے میں اللہ کے ساتھ اوروں کو بھی شریک بنانے لگ جاتے ہیں) اس جگہ صحیح وسالم اور تندرست و توانا بچہ کے لئے صَالِحًا کا لفظ استعمال ہوا ہے جو اس کے مفہوم کو واضح کر رہا ہے۔ سورۂ انبیاء میں ہے کہ حضرت زکریاؑ کے ہاں اولاد نہ تھی۔ انہوں نے اس کے لئے اللہ سے دعا کی تو اللہ نے ان کی رفیقۂ حیات کو جو عقیم تھیں، اولاد کے قابل بنا دیا۔ وَاَصْلَحْنَا لَہٗ زَوْجَہٗ ۲۱/۹۰) لہٰذا اصلاح کے معنی اُن قابلیتوں اور استعدادوں کا پیدا ہونا ہے جن سے عمدہ نتائج مرتب ہوں۔ ان ہی معنوں میں یہ لفظ سورۃ النور میں استعمال ہوا ہے جہاں فرمایا کہ تمہارے غلام اور لونڈیوں میں سے (جو نزول قرآن کے وقت عربوں میں موجود تھے) جو نکاح کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ (وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَاِمَآئِکُمْ ۲۴/۳۲) ان کے نکاح کر دو۔

ان آیات سے صلاح و صالح کے معانی ہمارے سامنے آ گئے جن سے واضح ہو گیا کہ اس قانون سرمدی کی رو سے جو ہمارے موضوع کا محور اور اس زندگی بخش داستان کا زیب عنوان ہے، زمین کی وراثت و حکومت و مملکت) کے مستحق وہی ہوں گے جو اس کی صلاحیت و قابلیت رکھتے ہوں۔ جن میں زندگی اور اس کی توانائیاں تڑپ رہی ہوں۔ جن کے سینوں میں دم، جگر میں خون، بازوؤں میں قوت، پاؤں میں استقامت، ذہنوں میں جلا، نگاہوں میں روشنی، ارادوں میں بلندی اور عزائم میں پختگی ہو جو دنیا میں حکومت و سطوت کی زندگی بسر کرنے کی تمنا رکھتے ہوں۔ اور پھر اس تمنا کی تکمیل اور اس آرزو کے حصول کیلئے ایسی قوت فراہم کریں کہ جو قوم ان کے عزائم کی راہ میں مزاحم ہو اسے خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائیں۔ دنیا میں جس کے پاس قوت نہیں اس کا کوئی دعویٰ بھی سچا نہیں۔

حصار ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

جو اپنی قوتِ بازو سے زندہ رہنے کا حق قائم نہیں کرتا اسے کوئی زندہ رہنے نہیں دیتا

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

وہ قانون جس کے پیچھے قوتِ نافذہ نہ ہو، وعظ اور اپدیش بن کر رہ جاتا ہے۔ اسی لئے اس قانون کے ساتھ، جسے دنیا میں دین کی حیثیت سے مستمر و متمکن رہنا مقصود ہو، فولاد کی شمشیرِ جگر دار کی بھی ضرورت ہے۔ یہی وہ ضوابطِ قانون ہیں جن کے متعلق فرمایا کہ اس کے ساتھ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ (۲۵/۵۷)، ہم نے ضوابطِ دین اور میزانِ عدل کے ساتھ فولاد بھی نازل کیا جس میں بڑی شدت کی سختی ہوتی ہے لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۲۵/۵۷)، تاکہ لوگ جادۂ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند

کائناتِ زندگی را محور اند

یہی وہ قوت ہے جس کے متعلق فرمایا کہ:-

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ

بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ (۸/۶۰)

جس قدر قوت کے ساز و سامان اور گھوڑوں کے پرے کے پرے باندھ رکھنے کی تم میں استطاعت ہو وہ تم اللہ اور اپنے دشمن کے مقابلہ کے لئے ہر وقت تیار رکھو۔

قوت اور رباط الخیل کی جامعیت میں تمام سامان و آلاتِ حرب و ضرب، ساز و یراقِ جنگ و جدل، اور وسائل و اسبابِ مدافعت و محاربت شامل ہیں۔ زمانہ کے مقتضیات اور احوال و ظروف کے تبدل و تغیر سے ان اسباب و ذرائع کی نوعیتوں میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن قوت کی وہ روح جو زندگی کی اصل ہے، ہر جگہ بدستور قائم رہے گی۔ گوپئے کے پتھر سے لے کر ایٹم بم کے گولے تک، ایک ہی روح کے مظاہر، ایک ہی اصل کی شاخیں۔ ایک ہی جان کے پیکر، اور ایک ہی

نما کی نیام ہیں۔ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ ان پیکروں کا بدلنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ جس قوت کی نوعیتیں وقت کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتیں، وہ قوت اصافہ زندگی میں اسی طرح پیچھے رہ جاتی ہے جس طرح فلک پیما طیارہ کے مقابلہ میں تانبا جی کی بہلی"۔

ہاں تو! دنیا میں زندہ رہتا ہے جس میں زندہ رہنے کی استعداد ہو۔ آگے وہی بڑھتا ہے جس میں آگے بڑھنے کی استطاعت ہو۔ لہذا حکومت و مملکت اسی کی تقدیر میں ہوتی ہے۔ جس میں جہانبانی و جہانداری کی صلاحیتیں اور خسروی اور سریر آرائی کی قابلیتیں ہوں۔ اِنَّ فِی ھٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ۔

یہاں تک صالحیت کا صرف ایک گوشہ ہمارے سامنے آیا ہے جس کا نام مادی قوت (Physical Power) ہے۔ لیکن قرآن کی رو سے فقط مادی قوت سے صالحیت کی شرط پوری نہیں ہو جاتی۔ اس میں تو کافر و مومن کی کوئی تمیز نہیں۔ حزب اللہ اور حزب الشیطان کی کچھ تفریق نہیں۔ جو بھی مادی قوت حاصل کرلے، وہ غلبہ و استیلاء حاصل کرسکتا ہے۔ اور اس طرح صاحب حکومت و سلطنت بن سکتا ہے۔ آج دنیا میں جدھر نگاہ ڈالئے۔ ان ہی مادی قوتوں کا باہمی مقابلہ نظر آئے گا۔ جس کے پاس قوت اور اس سے حاصل کردہ سامان و ذرائع زیادہ ہیں، وہی سب سے بڑی سلطنت و حکومت کا مالک ہے اور یہ صرف آج ہی پر کیا موقوف ہے۔ دنیا کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے، ہر صفحہ پر یہی حقیقت فولاد کے ابھرے ہوئے الفاظ میں آپ کے سامنے آئے گی۔

لیکن، جیسا کہ ابھی ابھی کہا جاچکا ہے، قرآن کی رو سے فقط مادی قوت سے صالحیت کی شرط پوری نہیں ہو جاتی اور صرف اس کے زور پر قائم کردہ غلبہ و استیلاء اور تسلط و تمکن سے اصلاح نہیں پیدا ہوتی۔ اس نے بتایا ہے کہ اصلاح و فساد، دو الگ الگ نتائج ہیں۔ جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں۔ جو نظام سلطنت فقط مادی قوتوں کے استیلاء پر قائم

ہوتا ہے اس کا نتیجہ فساد ہوتا ہے۔ سورۂ شعراء میں دیکھئے، اس حقیقت کو کس قدر واضح طور پہ بے نقاب کیا گیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ۔

وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ○ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (۲۶/۱۵۱)

حدود فراموش سرکش قوتوں کے نظام کی اطاعت مت کرو۔ اس لئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اصلاح نہیں کرتے۔

سورۂ نمل میں اسی ضمن (قصۂ حضرت صالحؑ) میں ارشاد ہے کہ

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (۲۷/۴۸)

اور اس شہر میں تو اکابر ارکان سلطنت، تھے جو ملک میں فساد برپا کر رہے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔

یہی ہیں وہ لوگ جن کے متعلق قرآن کی ابتدائی آیات میں کہدیا گیا ہے کہ

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ○ (۲/۱۱)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت برپا کرو تو یہ کہتے ہیں کہ ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں!

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے قرآن نے ان چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھدیا ہے۔ عہد قدیم کے نمارید و فراعنہ سے لیکر عصر حاضر کے "ہٹلران وچرچلان" میں سے کسی سے پوچھئے، ہر پیکر فساد و استبداد یہی کہے گا کہ ہماری غرض اصلاح ہے، مفسدین تو دوسرے ہیں۔ گذشتہ جنگ عمومی میں ہر فریق متخاصم کی زبان پر یہی تھا کہ ہم حق و صداقت اور عدل و انصاف کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اور اب بھی مغربی بساطِ سیاست کے ہر مہرہ باز کا یہی اعلان ہے کہ إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ لیکن قرآن کی رو سے ہر وہ نظام جو ذاتی اغراض و مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے قوت کے زور پر قائم کیا جاتا ہے۔ باطل کا نظام ہے جس کا نتیجہ فساد کے سوا کچھ نہیں۔ اصلاح صرف اس نظام کا نتیجہ ہے جس میں قوت کا استعمال آئین خداوندی کی تنفیذ و ترویج کے لئے ہوتا ہے۔ اس نظام کا فطری نتیجہ

عدل ہوتا ہے اور عدل سے مفہوم ہے ایسی فضا جس میں ہر شخص کی فطری صلاحیتوں کے ابھرنے، نشوونما پانے اور تکمیل تک پہنچنے کے لئے یکساں مواقع میسر ہوں۔ شرفِ انسانیت اسی نظام میں، ارتقائی منازل طے کر کے اپنی انتہا تک پہنچ سکتا ہے

اگر بایں نہ رسیدی تمام بولہبی است

اس نظام کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ محکومیت و اطاعت صرف احکام خداوندی کی ہو گی اور جس جماعت کے ہاتھوں ان احکام کی تنفیذ ہو گی وہ اپنے ہر قول و فعل کے لئے اپنے خدا کے سامنے ذمہ دار ہو گی۔ اس ایمان کی بنیاد پر جو عمارت قائم ہو گی اس کا نام عمل صالح ہے اور ان دونوں کا نتیجہ استخلاف فی الارض۔ یہی وہ استخلاف (وراثتِ ارض) ہے جس کے لئے صالحیت کی شرط ہے۔ یا یوں کہئے کہ جب اور جہاں اس قسم کی صالحیت پیدا ہوئی، وراثتِ ارض اس کا فطری نتیجہ ہوئی۔ اسی کا نام "اللہ کا وعدہ" ہے جس کا ذکر سورۂ نور کی ان درخشندہ آیات میں کیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۲۴/۵۵)

اللہ نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ تم میں سے جو بھی ایمان لائیں گے اور صالح العمل ہوں گے انہیں اللہ زمین میں حکومت عطا کرے گا۔ جس طرح ان شرائط کے پورا کرنے والوں کو اس سے قبل، وراثتِ ارض کی نعمتوں سے مالا مال کیا گیا۔

یہ استخلاف (وراثتِ ارض) کس غرض کے لئے ہو گی؟ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ (۲۴/۵۵) تاکہ وہ نظام نہایت مضبوطی سے قائم کر دیا جائے جو اللہ نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (۲۴/۵۵) تاکہ ان کی حالتِ خوف کو کامل امن و سکون سے بدل دیا جائے اور اس طرح يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا (۲۴/۵۵) یہ صرف قوانین الٰہیہ کے مطیع و محکوم ہوں۔ دنیا کی کوئی قوت ان سے اپنی حاکمیت نہ منوا سکے۔

یہ ہے وہ استخلاف، حکومت، جو وراثت ارض سے متعلق اس قانون سرمدی کی رو سے حاصل ہوتی ہے جو ہمارے پیش نظر موضوع کا عمود ہے۔

لیکن اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ سوال اس قدر اہم ہے کہ اگر اس کا صحیح جواب سامنے نہ آئے تو اصلاح اور فساد کا فرق نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے اور انسان تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر صالحیت کی اس شرط کو پورا کرنے سے جو حکومت و مملکت عطا ہوتی ہے، وہ خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ تو جو حکومت و سلطنت فقط مادی قوتوں کے زور سے حاصل کی جاتی ہے۔ کیا وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتی؟ اسے کون دیتا ہے؟ اگر آپ بغور دیکھیں گے تو اس سوال کے ڈانڈے مسئلہ تقدیر سے جا ملیں گے۔ مسئلہ تقدیر کی بحث بڑی تفصیل طلب[1] ہے۔ اور اس وقت ہمارے موضوع سے خارج۔ اس مقام پر صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ جس انداز سے یہ مسئلہ عام طور پر مسلمانوں کے قلوب و اذہان پر مستولی ہے اور جس کی وجہ سے یہ قوم گذشتہ ایک ہزار برس سے راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے۔ اس سوال کا محرک بھی وہی ہے۔ تقدیر کا یہ مفہوم بنو امیہ کے زمانہ کی تخلیق ہے جسے انہوں نے اپنی ملوکیت کے استبداد کے "شرعی جواز" کی غرض سے وضع کیا اور پھر سیاسی حیلہ کاریوں سے اس طرح پھیلایا کہ یہ ایک حقیقت ثابتہ بن کر امت کے قلوب کی گہرائیوں میں سرایت کر گیا اور وہاں سے آج تک نہیں نکل سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک دولت اور قوت، حکومت و سطوت فی ذاتہٖ "خدا کی نعمت" اور اس کی "عطا فرمودہ" قرار پا چکی ہے۔ بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ دولت و قوت کس طریق سے حاصل کی گئی ہے اور اسے کس مصرف میں لایا جا رہا ہے؟ ہم جس دولتمند کا ذکر کرتے ہیں، بلا تامل کہہ دیتے ہیں کہ اس پر "اللہ کا بڑا فضل" ہے۔ ہر صاحب شوکت و سطوت کے متعلق یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ "اللہ کی دین" ہے

---

[1] اس کی تفصیلی بحث کے لئے معارف القرآن، جلد اوّل دیکھیے۔

اس غیر محسوس عقیدہ کی رو سے ہمارے نزدیک "دولت" خدا کی نعمت ہے خواہ وہ کسی نے ڈاکہ ڈال کر حاصل کی ہو یا بطریق طیب۔ ہمارے ان قدیمی تصورات کی رو سے "حکومت" اللہ کا انعام ہے خواہ اسے ابلیسی تغلب اور طاغوتی سیاست کے بل بوتے پر قائم رکھا ہو، یا ایمان و عمل صالحہ، کی بنا پر۔ غور کیجئے! ہماری زبان میں "اللہ کی دین" کے مقابلہ میں کسی اور کی دین کے لئے کوئی اصطلاح ہی موجود نہیں۔ اس لئے کہ ہمارے نزدیک ڈاکو کو بھی خدا دیتا ہے اور ایک مرد کامل کو بھی۔ لہٰذا طاغوتی قوتوں کی حکومت بھی خدا کی طرف سے ہوتی ہے اور اس لئے اس کے قانون وراثت (یرثھا عبادی الصالحون) کے تابع، اور اس بنا پر صالحون کے معنی ہو جاتے ہیں ہر وہ قوم جو حکومت قائم کرنے کی قوت پیدا کرلے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر فرعون کی حکومت بھی اسی قانون خداوندی کی رو سے ملی تھی تو حضرت موسیٰؑ کو اس کے خلاف، اتنی بڑی مہم کے لئے کیوں مامور کیا گیا تھا؟ اگر باطل کا دولتی نظام بھی اسی ابدی قانون وراثت کا نتیجہ ہوتا ہے تو اس کی جگہ حق کا نظام قائم کرنے کے لئے اس قدر سرفروشیوں اور جاں سپاریوں کی تاکید کیوں کی جاتی ہے؟ حق و باطل کی یہ کشمکش و پیکار تو اسی بنا پر ہے کہ ان میں سے ایک (باطل) منجانب اللہ نہیں ہوتا۔ اگر قانونِ وراثت ارض، صرف حصول قوت ہی کا دوسرا نام ہے تو اس کے لئے عرش عظیم سے آنے والے پیغامات کی کیا ضرورت ہے۔ اسے تو دنیا کا ہر بلا کو اور ہر خونخوار از خود جانتا ہے۔ اگر نیٹشے کا مافوق البشر، قرآن کا مرد مومن ہے۔ تو پھر حکمت فرعونی اور حکمت کلیمی میں کیا فرق ہے؟ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ خالص قوت کی بنا پر جو نظام حکومت قائم کر لیا جاتا ہے اسے خدا کے متعین فرمودہ قانونِ وراثت کا نتیجہ، اور فلہٰذا من جانب اللہ نہیں کہا جا سکتا۔ منجانب اللہ استخلاف فی الارض وہی ہوتا ہے جو اس کے قانون سرمدی کا نتیجہ اور قرآنی صالحیت کا ثمرہ ہو۔ اور یہی وہ استخلاف ہے جو ہمارے موضوع کا عنوان ہے۔ اور اسی سے مسلمان کو سروکار ہونا چاہیئے۔

صالحیت کا قرآنی مفہوم متعین کرنے کے بعد، اب ہمیں آگے بڑھنا چاہیئے۔ وراثتِ ارض (یعنی قوانین الٰہیہ کے مطابق حکومت قائم کرنے) سے پہلے، عام طور پر۔ قوم کی حالت یا تو یہ ہوگی کہ ان پر کسی دوسرے کی حکومت نہیں ہوگی۔ یعنی یا تو ان کی اپنی حکومت ہوگی۔ لیکن اس غلبہ و تسلط کے آئین کے مطابق جس کی رو سے عام انسانی حکومتیں قائم ہوتی ہیں۔ یا سرے سے کسی دولتی نظام کا وجود ہی نہ ہوگا۔ اور قوم قبائلی قسم کی زندگی بسر کر رہی ہوگی۔ یا دوسری صورت میں قوم کسی مستبد حکومت کی محکوم ہوگی۔ اوّل الذکر صورت میں (یعنی جب حکومت اپنی ہو یا سرے سے کسی منظم حکومت کا وجود ہی نہ ہو) اس قوم کو اس امر کی امکانی قدرت حاصل ہوگی کہ وہ چاہے تو اپنے اندر صالحیت پیدا کر کے۔ آئین فطرت کے مطابق وراثتِ ارض کی دولت سے متمتع ہو جائے۔ اس صورت میں مقابلہ ان لوگوں سے ہوگا جو اس انداز کے حکومت کے قیام میں اپنی ذاتی اغراض کا نقصان عظیم سمجھتے ہوں اور اس لئے اس تحریک کی مخالفت میں سرگرم عمل ہو جائیں۔ ایسی صورت میں وہ قوم یا تو فریق مخالف پر غلبہ حاصل کر لے گی اور اگر اس کا فوری امکان نہ ہوگا تو کسی اور خطۂ ارض کی طرف ہجرت کر کے اسے اس آئینِ حکومت کی قرارگاہ بنائے گی۔ یہ وراثتِ ارض فطری نتیجہ ہوگی ان کی صالحیت کا۔ نبی اکرمؐ کی دعوت کے وقت، قوم مخاطب کی یہی حالت تھی۔ عرب کسی غیر حکومت کے تابع نہیں تھے۔ قبائلی زندگی بسر کرتے اور اپنی روایات کے مطابق اپنے معاملات کا فیصلہ کر لیتے تھے۔ اس لئے انہیں امکانی قدرت حاصل تھی کہ وہ چاہتے تو اپنے اندر داخلی تبدیلیاں پیدا کر کے وراثتِ ارضی کے مستحق بن جاتے۔ نبی اکرمؐ کی بصیرت افروز تعلیم اور حقیقت کشا عمل سے اس قوم نے وہ تربیت حاصل کر لی، جس سے ان کے خفتہ جوہر بیدار ہو گئے اور وہ قوم اصلح بن کر استخلاف فی الارض کے مقام محمود تک پہنچ گئی۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ یہ خدا کے عدل کا مظاہرہ تھا۔

دوسری صورت کی مثال ہمارے سامنے قوم بنی اسرائیل کی ہے جو دعوتِ

حضرت موسیٰؑ کے وقت فرعونِ مصر کے پنجۂ قہرمانیت میں گرفتار تھی جسے قرآن نے سوء العذاب اور بلاءِ عظیم کی جامع اصطلاحات سے تعبیر کیا ہے۔ ان پر فرعونی حکومت کے مستبد قوانین مسلط تھے اس لئے وہاں رہتے ہوئے انہیں اس امر کی امکانی قدرت حاصل نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے جوہر خوابیدہ کو بیدار کر کے ان میں نمود و بالیدگی پیدا کر سکیں۔ اس کے لئے آزاد فضا کی موجودگی نہایت ضروری تھی۔ یعنی بالفاظ دیگر صورت یہ پیدا ہو چکی تھی کہ۔

(۱) جب تک وہ اپنے اندر صالحیت نہ پیدا کر لیں، آزادی نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔

(۲) لیکن صالحیت پیدا نہیں ہو سکتی تھی جب تک وہ فرعون کے پنجۂ استبداد سے آزاد نہ ہو جائیں۔

عدل کی رو سے انہیں ہمیشہ کے لئے فراعنہ کی غلامی میں رہنا چاہیئے تھا۔ لیکن خدا کے ہاں عدل کے ساتھ احسان بھی ہے۔ احسان کا تقاضا تھا کہ انہیں اس مستبد حکومت کی غلامی سے نجات دلا کر وہ امکانی قدرت عطا کر دی جائے (یعنی ایسے مواقع پیدا کر دیئے جائیں) جس سے وہ اپنے اندر صالحیت پیدا کر کے وراثتِ ارض کی نعمتِ عظمیٰ کے مستحق بن جائیں۔ یہی وہ حقیقت کبریٰ ہے جسے قرآن نے ان درخشندہ الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

وَنُرِيدُ أَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ (۲۸/۵)

اور ہم نے چاہا کہ وہ لوگ جنہیں ملک میں (غلامی و محکومی کے شکنجوں میں جکڑ کر) بیحد کمزور کر دیا گیا تھا۔ ان پر احسان کریں۔ اور انہیں امام (قوموں کی قیادت کرنے والے) بنائیں۔ اور انہیں (حکومت و مملکت کا) وارث بنائیں اور (اس طرح) انہیں زمین میں تمکن کر دیں۔

لہٰذا انہیں فرعون کی غلامی سے نجات، بطور انعام موہبت کر دی گئی اور انہیں امن کی وادیوں میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں ان پر کسی غیر کی حکومت نہ تھی اور اس طرح ان کے لئے ایسی امکانی قدرت

پیدا کر دی گئی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو تربیت دے کر وراثتِ ارض کے مستحق بن جائیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان بالکل اسی طرح ملا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وراثت ارض یا استخلاف ہے، وہ حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وراثتِ ارض بلا مزد و معاوضہ نہیں ملا کرتی۔ وہ فطری نتیجہ ہوتی ہے صالحیت کا، اور صالحیت ایمان اور اعمال صالحہ کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی اتفاقاً اور احساناً صرف غیروں کی غلامی سے رستگاری عطا ہوتی ہے تاکہ اس سے صالحیت پیدا کرنے کی امکانی قدرت نصیب ہو جائے۔ ہمیں اس وقت صرف ایک خطۂ زمین ملا ہے جس پر کسی کی حکومت نہیں۔ اب ہم چاہیں تو

(۱) اپنے اندر صالحیت پیدا کر کے، اس زمین پر خدا کی بادشاہت کا تختِ اجلال بچھا دیں۔

(۲) صرف مادی قوتوں کے زور سے غلبہ و استیلا پیدا کر کے اسی قسم کی سلطنت تشکیل کریں جس قسم کی سلطنتیں دوسری طاغوتی قوتوں نے قائم کر رکھی ہیں۔ اور یا

(۳) موجودہ جمود و تعطل اور بے عملی اور بے حسی کی زندگی سے اس امکانی قدرت کو بھی کھو بیٹھیں اور پھر کسی اور کی غلامی سے بدستور سابق جہنم کی لعنتی زندگی میں گرفتار ہو جائیں۔

ہم نے کہا ہے کہ ہماری حالت ایسی ہی ہے جیسی اس وقت بنی اسرائیل کی تھی۔ اب آیئے دیکھیں کہ اس حالت میں بنی اسرائیل نے کیا کیا۔ اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ وَفِيهَا بَصَائِرُ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ

بنی اسرائیل کو اللہ کی اس موہبتِ عظمیٰ پر، قدم قدم پر، تشکر و امتنان کے سجدے کرنے چاہیئے تھے۔ یہ انعام کچھ چھوٹا انعام، اور یہ احسان کچھ کم احسان نہ تھا فرعون جیسے مجسمۂ استبداد و قہرمانیت کے دست جور و ستم سے رستگاری کوئی معمولی بات نہ تھی۔ لیکن صدیوں کی غلامی سے بنی اسرائیل کے جوہرِ انسانیت قریب قریب مردہ ہو چکے تھے۔ نہ ان کے سینہ میں زندہ آرزوؤں کی مقدس قندیل تھی، نہ ان کی نگاہوں میں بلند مقاصد کی ماہتاب درخشندگی۔ دنیا میں غلامی ہزار لعنتوں کی ایک لعنت اور لاکھ نحوستوں کی ایک نحوست ہوتی ہے۔ غلامی میں وہ تمام عیوب و نقائص

جیسے جسد انسانیت کیلئے مذآم کہنا چاہیئے۔ اس انداز سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے تباہ کن اثرات کب اور کن راہوں سے خون کے اندر حلول کر گئے۔ غلامی میں انسان زندگی کے حقائق کے مقابلہ سے جی چراتا ہے اور قفس کے خوگر پرندے کی طرح، اس عافیت کوشی کی زندگی کو عین حیات سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

صدیوں کی غلامی سے ان میں عزم و استقلال کے جوہر بہت کم رہ گئے تھے۔ محکومی سے تن آسانی او سہل انگاری کی افسردگی ان کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی اور وہ اس نہج زندگی کے اس درجہ عادی ہو چلے تھے کہ ان پر

قفس ہوا تھا حلال اور آشیانہ حرام

نتیجہ اس کا یہ کہ وہ ہر انقلاب آفریں تدبیر میں مصائب و مشکلات کے طوفان پوشیدہ دیکھتے تھے۔ تبدیلیٔ احوال کے تصور سے ان کا دل بیٹھنے لگتا تھا۔ حضرت موسیٰؑ انہیں بار بار تاکید کرتے تھے کہ ذرا ہمت اور استقلال سے کام لو اور پھر دیکھو کہ اللہ کی تائید و نصرت کس طرح تمہارے سامنے ہوتی ہے۔ راستہ کی مشکلات کو استقامت سے برداشت کر جاؤ۔ انجام کار میدان تمہارے ہی ہاتھ رہے گا۔ ذرا اپنے اندر صالحیت پیدا کر لو، وراثت ارض تمہارے لئے مقدر ہو چکی ہے۔

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (۷/۱۲۸)

تب موسیٰ نے اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ خدا سے مدد مانگو اور (اس راہ میں) جمے رہو۔ بلاشبہ زمین (کی بادشاہت) صرف خدا کے لئے ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اپنے قانون مشیت کے مطابق اس کا وارث بنا دیتا ہے اور انجام کار انہی کے لئے ہے جو متقی ہوں۔

توراۃ میں ہے۔

> اور جب فرعون نزدیک ہوا اور بنی اسرائیل نے آنکھیں اوپر کیں اور مصریوں کو اپنے پیچھے آتے دیکھا تو وہ شدت سے ڈرے۔ تب بنی اسرائیل نے خداوند سے فریاد کی اور موسیٰ سے کہا کہ کیا مصر میں قبروں کی جگہ نہ تھی کہ تو ہم کو بیابان میں مرنے کے لئے لایا؟ تو نے ہم سے یہ کیا معاملہ کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا؟ کیا یہ وہی بات نہیں جو ہم نے مصر میں تجھ سے کہی تھی کہ ہم سے ہاتھ اٹھا تاکہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر تھا (خروج ۱۴ ب ۱۱-۱۲)

غور کیجئے! غلاموں کی نفسیاتی کیفیت کس طرح جھلک کر باہر آ رہی ہے جو یہ کہہ رہے ہیں کہ مصریوں کی خدمت گذاری اس سے کہیں بہتر تھی۔ اس سے بڑی بدبختی اور کس کی ہوگی جو قفس کو آشیانہ سے بہتر سمجھے کہ آشیانہ میں کہیں خوفِ برق ہے کہیں خطرۂ صرصر۔ کبھی فکرِ معاش ہے اور کبھی خدشۂ صیاد۔ قفس کی زندگی میں یہ تمام تفکرات و خدشات آقا کے ذمہ تھے۔ اللہ اکبر! "حکمراں کی ساحری" بھی کس درجہ کامیاب ہوتی ہے جو انسان کی فطرت بدل دیتی ہے وہ فطرتِ صحیحہ جو انسان کو یہ سکھاتی ہے کہ

حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

ایسی درجہ مسخ ہو جاتی ہے کہ خطرہ نہیں، بلکہ خطرہ کا تصور بھی اسے مرگِ ناگہانی بن کر دکھائی دیتا ہے۔ محکومیت کی افیون سے اس کے قوائے عملیہ اس درجہ مخدر ہو جاتے ہیں کہ جدّ و جہد اور سعی و کاوش کی زندگی اس کے لئے مصیبت بن جاتی ہے۔ عافیت کوشی اور سہل انگاری ہے، کہ جس کے لئے حاکم قوم کی طرف سے خاص طور پر اسباب و ذرائع مہیا کئے جاتے ہیں۔ ان کی قوتِ برداشت بالکل سلب ہو جاتی ہے اور وہ بات بات پر جھلا اٹھتے ہیں۔ محکومیت کا زہر کس قدر میٹھا، خواب آور اور چپکے چپکے، غیر محسوس طور پر موت کی طرف لیجانے والا ہوتا ہے!

یہی وہ زہر تھا جو بنی اسرائیل کے خون کے ہر ذرہ میں سرایت کرچکا تھا اور انہیں ذراسی تکلیف پر اس امر کا دلی تاسف ہوتا تھا کہ ہم مصر کی محکومیت سے کیوں آزاد ہوگئے! چنانچہ تورات میں دوسری جگہ ہے۔

> پھر وہ ایلیم سے روانہ ہوئے اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت زمین مصر سے خارج ہوکر دوسرے مہینے کے پندرھویں دن سین کے بیابان میں جو ایلیم اور سینا کے کے درمیان ہے پہنچی اور ساری جماعت بنی اسرائیل کی اس میدان میں موسیٰ اور ہارون پر جھنجھلائی۔ اور بنی اسرائیل بولے کہ کاش ہم خداوند کے ہاتھ سے، زمین مصر میں جس وقت کہ ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھتے تھے اور روٹی من بھر کے کھاتے تھے مارے جاتے۔ کیونکہ تم ہم کو اس بیابان سے نکال لائے ہو کہ سارے مجمع کو بھوک سے ہلاک کرو۔ (خروج ۱۶/۱-۳)

آپ نے دیکھا ہے کہ انہیں کس چیز کی یاد ستا رہی تھی؟ گوشت کی ہانڈیوں کی! یعنی جیل خانے کی روٹیوں کی یاد! یا للعجب!! سحر حکمرانی کس قدر قلب ماہیت پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے دیدۂ شاہین میں نگہ خفاش رکھ دی جاتی ہے، جو جہنم کے شجرۃ الزقوم کو ثمر بہشت بنا کر دکھاتی ہے یہی کیفیت بنی اسرائیل کی ہو چکی تھی۔ ایک میدان میں پہنچے جہاں ذرا پانی کی قلت تھی تو پھر وہی واویلا مچانا شروع کر دیا کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال لائے ہو؟

> تب بنی اسرائیل کی جماعت نے...... رفیدیم میں ڈیرا ڈالا۔ وہاں لوگوں کے پینے کو پانی نہ تھا۔ سو لوگ موسیٰ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ ہم پئیں۔ موسیٰ نے انہیں کہا کہ تم مجھ سے کیوں جھگڑتے ہو اور خداوند کا کیوں امتحان کرتے ہو؟ اور وہ لوگ پانی کے پیاسے تھے۔ سو لوگ موسیٰ پر جھنجھلائے اور کہا کہ تو ہمیں مصر سے کیوں نکال لایا کہ ہمیں اور ہمارے لڑکوں کو اور ہماری مواشی کو پیاس سے ہلاک کرے۔
>
> (خروج ۱۷/۱-۳)

غرضیکہ وہ قدم قدم پر روٹھ جاتے تھے اور ہر بار یہی طعنہ دیتے تھے کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال لائے؟ قرآن کریم نے اس قوم کی داستانِ زندگی کو جو اس طرح اپنے دامن میں محفوظ کر رکھا ہے اور مختلف مقامات پر اسے بار بار سامنے لاتا ہے تو اسی لئے کہ اس کے اندر ہر دیدۂ بینا کے لئے عبرت و موعظت کے ہزار سامان پوشیدہ ہیں۔ مدتوں کی غلامی سے قوموں کی کیا حالت ہو جاتی ہے؟ اس کا اندازہ لگانا ہو تو داستانِ بنی اسرائیل کو غور سے پڑھئے۔ چنانچہ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ اللہ کی وہ موہبت و نعمت جو انہیں بلا محنت و مشقت مل گئی تھی ان کے لئے وبالِ جان اور بلائے بے درمان بن رہی تھی۔

بجو کے می رسد ایں راہ پیمائے تن آسانے
ہزاراں سال منزل در مقامِ آزری کردہ

انہیں مصر کی لعنتی زندگی سے نکال کر سینا کے میدانوں میں اس لئے لایا گیا کہ وہ اپنے جوہرِ خودی کی تربیت کریں اور اس طرح اپنے اندر ایسی فولادی سیرت پیدا کر لیں کہ وہ مصائبِ زندگی میں ہر مشکل کا مقابلہ کر سکے۔ اور یوں اپنے پیکرِ خاکی کے ذراتِ کہن کو ترکیبِ نو دیکر اس سے ایک جہانِ دیگر کی تعمیر کر لیں کہ جو وراثتِ ارض کی قرارگاہ بن جائے۔ لیکن ان کی جو حالت تھی وہ آپ کے سامنے ہے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ قدم قدم پر حضرت موسیٰؑ کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ اور عجیب و غریب مطالبات پیش کرتے۔ سینا کی وادیوں سے گذرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں کے لوگ کسی بت کی پوجا کر رہے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے کہ ہمیں بھی ایسا ہی بت بنوا دیجئے: قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰـهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (۷/۱۳۸)، حتیٰ کہ حضرت موسیٰؑ جب چند دن کے لئے طور کی چوٹیوں پر تشریف لے گئے تو انہوں نے گوسالۂ سامری کی پرستش شروع کر دی۔ جب ان سے کہا گیا کہ تورات کے احکام کی پابندی کرو کہ یہ احکام تمہارے خدا نے دیئے ہیں تو اڑ کر بیٹھ گئے کہ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (۲/۵۵)۔ ہم کبھی ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم خدا کو کھلے طور پر نہ دیکھ لیں۔ وادیٔ ایمن میں صحرا کی صاف و سادہ غذا

مائدۂ فطرت پر کھانے کو ملتی تھی۔ لیکن انہیں رہ رہ کر شہر کی، مسالہ دار، زندگی کی یاد ستاتی تھی چند روز کے بعد منہ بسور کر بیٹھ گئے کہ لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ (۲/۶۱) ہم سے ہر روز ایک ہی چیز نہیں کھائی جائے گی۔

جب محکوم قوم کے قوائے عملیہ مضمحل اور ان کے جوہر مردانگی مسلوب ہو جاتے ہیں تو تو ان کے پاس نقط باتیں ہی باتیں رہ جاتی ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں، عمل کے بجائے شاعری شروع کر دیتی ہے، بات بات پر منطقی موشگافیاں، قدم قدم پر فلسفیانہ نکتہ آرائیاں۔ زندہ قوموں کا شیوہ زندگی ہوتا ہے "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا" سنا اور اس پر عمل پیرا ہو گئے۔ وہ کام زیادہ کرتے ہیں اور باتیں بہت کم۔ لیکن محکوم قوم باتیں ہی باتیں کرتی ہے، کام بالکل نہیں کرتی۔ یہی حالت بنی اسرائیل کی ہو چکی تھی اُن سے کہا گیا کہ ایک گائے ذبح کر لو۔ کس قدر صاف اور سیدھی بات تھی۔ لیکن سورۂ بقرہ کو اٹھا کر دیکھئے۔ انہوں نے اس پر بھی کتنی باتیں بنائی ہیں اور کس طرح بال کی کھال نکالنا شروع کی ہے۔ یہ ہوتی ہے محکوم کی ذہنیت!

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ مصر سے خروج، بنی اسرائیل کے لئے مقصود بالذات نہ تھا۔ فرعون کی محکومیت سے رستگاری اس مقصد کے لئے ہوئی تھی کہ یہ قوم صحرائے سینا کی تربیت گاہ میں اپنے اندر صالحیت کے جوہر پیدا کرے۔ تاکہ ارض مقدس (فلسطین) کی وراثت ان کے حصہ میں آجائے۔ حضرت موسیٰؑ انہیں سرزمین فلسطین کے کنارے تک لے گئے اور ان سے کہا کہ یہ ہے وہ زمین جو تمہارے خدا نے تمہارے نام لکھ دی ہے۔ اٹھو اور اس پر قبضہ کر لو۔

یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ ۝ (۵/۲۱)

لوگو اس مقدس سرزمین میں جسے خدا نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے (یعنی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ عزم و ہمت کے ساتھ) داخل ہو جاؤ۔ اور الٹے پاؤں پیچھے

کی طرف نہ بڑھو (کہ کامیاب ہونے کی بجائے) نقصان اور تباہی میں پڑ جاؤ گے۔

لیکن ان کی یہ حالت تھی کہ ضعفِ خودی سے ان پر خوف طاری تھا۔ سپاہیانہ عزم کے تصور سے ان پر رعشہ چھا رہا تھا۔ فریقِ مقابل کے آدمی انہیں دیو نظر آتے تھے۔ انہوں نے جواب دیا۔

قَالُوا يٰمُوسٰى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝ (۵/۲۲)

لوگوں نے اس کے جواب میں کہا اے موسیٰ اس سرزمین میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو بہت ہی زبردست ہیں (ہم میں ان کے مقابلہ کی تاب نہیں) جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے۔ ہاں اگر وہ لوگ وہاں سے از خود نکل جائیں تو پھر ہم ضرور داخل ہو جائیں گے +

ذرا غور کیجئے اس منطق پر کہ فریقِ مقابل از خود وہاں سے نکل جائے۔ ہم پھر آگے بڑھیں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے بہتیرا سمجھایا لیکن ان پر اس پند و موعظت کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ (۵/۲۴)

وہ بولے۔ اے موسیٰ، جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس میں داخل ہونے والے نہیں (اور اگر تم وہاں جانے پر ایسے ہی مصر ہو تو) تم خود چلے جاؤ اور تمہارا خدا بھی تمہارے ساتھ چلا جائے تم دونوں وہاں ان کے ساتھ لڑنا (جب فتح ہو جائے ہمیں آواز دے دینا) ہم یہاں بیٹھے ہیں۔

لیجئے جواب مل گیا کہ ہماری بہبودی کی ایسی ہی تڑپ ہے تو جائیے۔ ان لوگوں سے لڑیئے اور اپنے ساتھ (معاذ اللہ) اپنے اس خدا کو بھی لے جائیے جس نے فتح و کامرانی کا وعدہ دے رکھا ہے۔ ہم یہاں انتظار کرتے ہیں۔ جب دشمن مغلوب ہو جائے تو ہمیں آواز دے لینا ہم پہنچ جائیں گے۔

اللہ اکبر! کیا ذہنیت ہے غلام کی!!

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ کیا وہ لوگ وراثتِ ارض کے مستحق بھی بلا محنت و مشقت ہو گئے؟ کیا انہیں وہ سرزمین یونہی اتفاقاً مل گئی؟ بالکل نہیں۔

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ؀ (۵/۲۶)

اللہ کا حکم ہوا کہ جب ان لوگوں کی حالت یہ ہے تو، اب چالیس برس تک وہ سرزمین ان پر حرام کر دی گئی۔ یہ اسی بیابان میں سرگرداں رہیں گے۔ سوائے موسیٰ تم ان نافرمان لوگوں کے اس مآل پر غمگین مت ہو (وہ اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرنا چاہتے اس لئے وہ اس محرومی کے مستحق ہیں)

چنانچہ حضرت موسےٰ آب و گل کے ان پیکروں کو چالیس برس تک جنگلوں اور صحراؤں میں پھراتے رہے تاکہ اس افیون خوردہ جماعت کا کوئی فرد باقی نہ رہے۔ اور جب ان کی نئی نسل جن کی تربیت مصر کی محکومی کی فضا سے الگ کر کے کی گئی تھی، بڑھ کر جوان ہو اور وہ اپنے اندر اس صالحیت کو پیدا کر لے جو وراثتِ ارض کے لئے شرط ہے، تو پھر ان کے ہاتھوں خدا کا نوشتہ پورا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب اس نئی پود نے اپنے اندر صالحیت پیدا کر لی تو وہ ایک ہی جست میں تمام منازل طے کر گئے اور استخلاف فی الارض کی مسند پر متمکن ہو گئے۔ كَذٰلِكَ ۭ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ؀ (۲۶/۵۹)

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ڏ بِمَا صَبَرُوْا (۷/۱۳۷)

اور جس قوم کو حقیر و کمزور خیال کیا جاتا تھا اسی کو ملک کے مشرقی و مغربی حصوں کا کہ ہماری بخشی ہوئی برکت سے مالا مال ہے، وارث کر دیا، اور اس طرح تیرے اللہ کی

بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی اس لئے کہ وہ ہمت اور استقامت سے جمے رہے تھے۔

یہ وراثت، صالحیت کا فطری نتیجہ تھی اور صالحیت، جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، ایمان محکم اور عمل پیہم سے پیدا ہوتی ہے اسی کو قرآن نے ۔ ایقان اور صبر ۔ کی جامع اصطلاح سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا ۖ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ ۞ (پ ۲۱)

اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے امام بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی قیادت کرتے تھے اور یہ اس لئے تھا کہ انہوں نے ثبات و استقامت کا ثبوت دیا اور وہ ہماری آیات پر محکم یقین رکھتے تھے۔

یہ ہیں داستان بنی اسرائیل کے وہ اجزاء، جو ہمارے موضوع زیر نظر سے براہ راست متعلق ہیں۔[1] اس میں ۔ ۔ ۔ ۔ استخلاف فی الارض (وراثت زمین) کے سلسلہ کی دو متمیز دو کڑیاں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک وہ جسے ابتدائی حصہ کہنا چاہیئے۔ جس میں غیروں کی محکومیت سے اس لئے رستگاری ملتی ہے کہ اس قوم کو اپنی صلاحیتوں کے نمود و ارتقاء کے لئے امکانی مواقع مل جائیں۔ اور دوسرا حصہ وہ ہے جس میں صالحیت کی پختگی کے بعد وہ قوم وراثت ارض کی مستحق قرار پا جائے۔ حصول صالحیت کا ابتدائی مرحلہ ہو یا استخلاف و وراثت کا آخری حصہ، دونوں میں مواقع اس لئے بہم پہنچائے جاتے ہیں کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ وہ قوم اس قدرت و اختیار سے کس طرح فائدہ اٹھاتی ہے۔ پہلے مرحلہ میں یہ دیکھا جائے گا کہ وہ قوم اپنے اندر صالحیت پیدا کرتی

---

[1] داستان بنی اسرائیل اپنے اندر عبرت و موعظت کے بڑے سامان رکھتی ہے اور ہمارے حالات پر تو یہ اس طرح منطبق ہوتی ہے کہ جو باریک بین نگاہ اسے دیکھے گی بیساختہ پکار اٹھے گی کہ ؎ اے دل یہ تو اپنی داستان معلوم ہوتی ہے

اس داستان کی تفاصیل و تضمنات، معارف القرآن جلد سوم میں ملیں گی۔ اس مضمون کا یہ حصہ بھی بیشتر اسی سے ماخوذ ہے۔

ہے یا نہیں۔ اور دوسرے میں یہ کہ قوت و اختیار ملنے کے بعد وہ قوم اس کا استعمال صحیح طور پر کرتی ہے یا نہیں۔ حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے، جبکہ وہ ابھی فرعون کے زیر حکومت تھی کہا...... وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۱۲۹/۷) ''قریب ہے کہ اللہ تمہیں استخلاف فی الارض عطا کر دے۔ پھر دیکھے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو'' اور قوم محمد رسول اللہ سے کہا گیا کہ

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِن قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا ۙ وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ۞ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِن بَعْدِهِمْ لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ۞ (۱۰/۱۳-۱۴)

اور یقیناً ہمارے قانون مکافات عمل نے، تم سے پہلے کئی نسلوں کو ہلاک کر دیا جب ان کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ (جادۂ عدل و انصاف سے ہٹ کر) ظلم کرنے لگ گئے (حالانکہ ان کے رسول ان کے پاس واضح حقائق لے کر بھی آئے لیکن باایں ہمہ ایسا نہ ہوا کہ وہ ایمان لے آتے) اس طرح ہم مجرم اقوام کو سزا دیا کرتے ہیں۔ پھر ان کے بعد ہم نے تمہیں زمین کی حکومت عطا کی تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح کا عمل کرتے ہو۔

لہٰذا امکانی مواقع یا قوت و اختیار کے خزانے اس لئے ملتے ہیں لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ

* * *

ان اصول و مبادیات کو سمجھ لینے کے بعد اب اپنی موجودہ حالت کی طرف آئیے اور اسی آئینے میں اسے بھی دیکھئے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کی سرزمین ہمیں بغیر صلاحیت کے مل گئی ہے۔ یہ ہماری سعی و عمل اور تگ و تاز کا نتیجہ نہیں۔ ہمارے اندر تو وہ داخلی تبدیلیاں پیدا نہیں ہوئیں جن کا مظہر خارجی تبدیلیاں ہوا کرتی ہیں۔ کیا عوام اور کیا خواص، ہم سب اسی سطح پر کھڑے ہیں جہاں اس سے پہلے تھے صلاحیت تو بہت بڑی چیز ہے، ہم میں تو وہ صلاحیت و استعداد بھی پیدا نہیں ہوئی جو محض مادی

کی وادیوں میں پرچشم کشائی، محض اعزاز و اکرام ہو گئی تھی۔ اس کے لئے خدا کی طرف سے کیا اسباب و ذرائع پیدا کئے گئے، اور احوال و ظروف کس طرح ایک خاص نہج و ترتیب پر متشکل ہوتے چلے گئے، یہ ایک الگ بحث ہے۔ حقیقت یہی ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے کہ یہ نتائج جو اس طرح مرتب ہوئے ہیں، ہماری استعداد و اہلیت کا ماحصل اور ہماری سعی و کاوش کا ثمرہ نہیں ہیں۔ یہ ہمیں بلا مزد و معاوضہ اور بلا محنت و مشقت خدا کی طرف سے احساناً ملے ہیں۔ اور ملے اس لئے ہیں "لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ"۔ غیروں کی حکومت میں ہمیں یہ مواقع حاصل نہیں ہو سکتے تھے کہ ہم اس صالحیت کو پیدا کر سکیں جو وراثت ارض کے لئے بنیادی شرط ہے یہ خطۂ زمین ان ہی مواقع کو بہم پہنچانے کے لئے عطا ہوا ہے۔ یہ کھلا میدان اس لئے دیا گیا ہے کہ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (تاکہ یہ دیکھ لیا جائے کہ ہم کیسے کام کرتے ہیں)۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، صالحیت مشروط ہوتی ہے ایمان و اعمال صالحہ پر، چنانچہ سورۂ عنکبوت میں ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ ۝

اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور (اس کے ساتھ) صالح العمل ہوتے ہیں تو ہم ان کو یقیناً صالحین کے زمرہ میں شامل کریں گے۔

اس حقیقت کو بھی قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ یہ راہ پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کی روش ہے اس میں بڑی بڑی تکالیف کا مقابلہ اور شدید مصائب کا سامنا ہوگا۔ مومن وہی ہے جو ان مصائب کو مردانہ وار برداشت کرے۔ جو اس راہ میں تکالیف سے جی چرائے، وہ مومن نہیں، قرآن کی رو سے منافق ہے۔ چنانچہ آیۂ مذکورہ صدر کے ساتھ ہی فرمایا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللَّهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللَّهِ وَلَئِنْ جَاءَ نَصْرٌ مِنْ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ

إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۚ أَوَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ ۝ وَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنَافِقِينَ ۝

اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم بھی اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن حالت یہ ہوتی ہے کہ جب اللہ کی راہ میں دکھ اٹھانا پڑتا ہے، تو لوگوں کی طرف سے آنے والی مصیبتوں کو اللہ کا عذاب سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن اگر تیرے اللہ کی طرف سے نصرت آئے تو اس (فتح وکامرانی کے وقت) پکار اٹھتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ کیا اللہ نہیں جانتا جو اہل جہان کے سینوں میں ہے؟ (ضرور جانتا ہے) اور اللہ یقیناً مومنین کو بھی دیکھ لیگا اور منافقین کو بھی۔

سو صالحیت کے لئے پہلی شرط جسمانی قربانی ہے اور دوسری شرط مالی ایثار جس کے متعلق فرمایا۔

وَأَنْفِقُوا مِنْ مَا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝

اور اللہ کے دیئے ہوئے میں سے (اس کی راہ میں) خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو اور وہ اس وقت کہے کہ یا اللہ! تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور کیوں نہ دی تاکہ میں مال خرچ کرتا اور اس طرح صالحین میں سے ہو جاتا۔

یہ اذیتیں اور مشقتیں، ظاہر ہے کہ مخالفین کے مقابلے سے پیدا ہوں گی۔ یہ مخالفت دو اطراف سے ہوگی۔ ایک تو خارجی دشمنوں کی طرف سے جو اس امکانی قدرت (میدان عمل) کو بھی گوارا نہیں کر سکتے، اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر اس خطۂ زمین پر ان کی حکومت مستقر و متمکن ہو گئی تو ان کا باطل آگیں نظام سب کا سب درہم برہم ہو جائے گا۔ باطل اپنی بنیادی کمزوری سے خوب واقف ہوتا ہے اس لئے وہ ہمیشہ نظام حق و صداقت کے قیام کی مخالفت میں پوری سعی و کاوش سے کام لیتا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی!

لہٰذا پاکستان کے مسلمانوں کو سب سے پہلے ان خارجی اعدا کی مکارانہ سازشوں اور محاربانہ منصوبوں کے مقابلہ کے لئے ہر وقت مستعد رہنا ہوگا کہ اگر ان کی کمزوری یا لاپرواہی سے خدانخواستہ ان کے مشئوم عزائم بروئے کار آگئے تو یہ امکانی قدرت جسے صالحیت یعنی وراثتِ ارضی کے حصول کا ذریعہ بننا ہے، یہیں ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اور کس قدر سوختہ سامان اور شوریدہ بخت ہے وہ قوم، جس کی جھولی میں پڑی ہوئی ایسی متاعِ گراں بہا، اس طرح سے چھن جائے"

خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے۔
ویلیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیاً منسیا

لیکن ان خارجی دشمنوں سے کہیں زیادہ شدید مخالفت خود اپنوں کی طرف سے ہوگی جو اس انقلاب سے اس لئے خائف ہوں گے کہ اس میں انہیں اپنی ملمع کارانہ سیادت اور ابلہ فریبانہ قیادت کی موت نظر آئے گی۔ یہی وہ گروہ ہے جو ہر زمانہ اور ہر قوم میں، ہر دعوتِ انقلابِ حق وصداقت کی مخالفت میں پیش پیش رہا ہے اور قرآن نے جسے مترفین کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے مترفین کے عناصرِ ترکیبی، ان کے نفسیاتی میلانات اور ذہنی رجحانات، ان کے خصائص ولوازم ان کے مقاصد و عزائم کیا ہوتے ہیں، یہ ایک تفصیل طلب بحث ہے جسے ہم کسی دوسرے وقت پر انحصار رکھتے ہیں۔ سر دست صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ مترف کے مفہوم میں تن آسان، سہل انگار نفس پرست، عیش پسند، دوسروں کی کمائی پر آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے کے عادی، سب داخل ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ ہر رسول کی دعوتِ انقلاب کی مخالفت کیا کرتے تھے۔

وَمَآ أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَآ إِنَّا بِمَآ أُرْسِلْتُم

بِہٖ کٰفِرُوْنَ ۝ (۳۴/۳۴)

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر اس کے مترفین نے کہا کہ ہم تمہارے

پیغام حق و صداقت سے انکار کرتے ہیں۔

ہر داعیٔ حق و صداقت کا پیغام، انقلاب آفرین و حریت بخش ہوتا ہے۔ وہ انسانی ذہنوں کے تراشیدہ نظامہائے زندگی کو الٹ کر ان کی جگہ فطرت صحیحہ کے مطابق نظام حیات قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس نظام کے تمکن میں ان مترفین کو جو پشتہا پشت سے دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت کی نرم و نازک زندگی بسر کرتے چلے آتے ہیں، اپنے لئے پیغام موت نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی تن آسانیاں اور سہل انگاریاں انہیں کسی تبدیلیٔ حالات کے قابل نہیں چھوڑتیں۔ اس لئے اُن کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس نہج و اسلوب پر قوم کا نظام معاشرت و تمدن چلا آرہا ہے اُسی پر چلتا جائے۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ
اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝ (۴۳/۲۳)

اور اس طرح ہم نے (اے رسول عربی) تم سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا
کہ اس کے مترفین گروہ نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو جس روش پر چلتے دیکھا
ہے اسی کی تقلید میں ہم نجات و سعادت کی راہ دیکھتے ہیں۔ ٭ ٭ ٭

یہی وہ قوم کے اکابر ہیں جو ہر دعوت انقلاب کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز اٹھاتے ہیں اس لئے کہ انہوں نے اپنی ساحرانہ فسوں طرازیوں اور شاطرانہ فریب سازیوں سے قوم کو سکھا یا ہی یہ ہوتا ہے کہ تم مرو تاکہ ہم زندہ رہیں، تم کماؤ تاکہ ہم تن آسانی کی زندگی بسر کریں، تم دکھ جھیلو تاکہ ہم سکھ اٹھائیں، تم سنو تو ہمارے کانوں سے، دیکھو تو ہماری آنکھوں سے، سوچو تو ہمارے دماغوں سے، سمجھو تو ہمارے دلوں کی راہ سے۔ چراغ تمہارے ہوں راتیں ہماری۔ زبان تمہاری ہو اور باتیں ہماری۔ تمہارے پسینے سے ہمارے گلستانوں میں آبیاریاں ہوں، اور

تمہارے خون کی رنگینی سے ہمارے ایوانوں میں گلکاریاں۔ اس لئے ہر وہ تبدیلی جس میں سرنگاک غریب کے لئے سامانِ زیست ہو ان کے لئے پیامِ موت ہوتی ہے۔ لہٰذا اُن کی طرف سے مخالفت یقینی۔ یہی ابد سے ہوتا آرہا ہے، یہی ازل تک ہوتا رہے گا۔ آج سے پانچ ہزار سال پیشتر جب معمورِ زمین میں سب سے پہلی مرتبہ یہ آواز حضرت نوحؑ کی زبان سے اٹھی تو ان ہی اکابر نے اس کی مخالفت کی۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۷/۶۰)

اس کی قوم کے اکابر نے کہا کہ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ تو اس دعوتِ انقلاب میں کھلی ہوئی گمراہی پر ہے۔

اور اسی کو جب حضرت ہودؑ نے دُہرایا تو مخالفت کی اس صدائے بازگشت نے اس دعوت کی مزاحمت کی۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (۷/۶۶)

اس کی قوم کے اکابر نے، جنہوں نے اس دعوت کی صداقت سے انکار کیا تھا، کہا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ تو حماقت میں مبتلا ہے اور جو کچھ کہتا ہے جھوٹ کہتا ہے۔

اور یہی وہ اکابرینِ قوم تھے جنہوں نے حضرت صالحؑ کی اس پکار کی مخالفت میں آواز اُٹھائی۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ (۷/۷۶)

اس قوم کے مستکبرین نے کہا کہ جس بات پر تم ایمان لائے ہو ہم اس سے انکار کرتے ہیں۔

یہی جواب حضرت لوطؑ کو ملا۔ (۲۹/۲۹) اور اسی نہج سے حضرت شعیبؑ کی دعوتِ انقلاب کا استقبال ہوا (۷/۸۸)۔ یہی وہ اکابر و جبابرۂ قوم تھے جنہوں نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں جھونک دینے کی ٹھانی تھی۔ اور یہی قوم فرعون کے وہ متکبرین و مترفین تھے جنہوں نے فرعون کو حضرت موسیٰؑ کے قتل کرنے کی صلاح دی تھی۔ یہی وہ سیادت و قیادت کے اجارہ دار تھے جنہوں نے جنابِ مسیحؑ کو حوالۂ دار و رسن کرنے کی سازش کی تھی۔ اس لئے کہ وہ خدا کی بادشاہت کو غریبوں کا حصہ بتاتے تھے۔

اور پھر یہی وہ رؤسا و امرائے عرب تھے جنہوں نے تمام عمر اس دعوت آسمانی کی سخت ترین مزاحمت و مخالفت کی جو حکومت و سلطنت کی کنجیاں مترفین سے چھین کر متقین کو دینے کے لئے بلند ہوئی تھی۔ یہی ہوتا رہا ہے اور آج بھی یہی ہوگا۔ اس خطۂ زمین پر جسے ہم پاکستان سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب اس انقلاب صحیحہ کی آواز اٹھے گی جو قوم میں صالحیت کا موجب بنے گا اور جس میں عزت و تکریم اور سیادت و امارت کے پیمانے بدل جائیں گے۔ تو اس کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز ان ہی مترفین کی طرف سے بلند ہوگی جو آج اپنے خود ساختہ معیاروں کے مطابق از خود واجب الاحترام بنے بیٹھے ہیں اور جن کی کیفیت یہ ہے کہ یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا (۳/۱۸۸) "وہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ وہ محض زبان سے کہتے ہیں لیکن) کرتے نہیں۔ اس کے لئے ان کی تعریف کی جائے" نہیں مستقلاً مسانید عظمت و منابر عقیدت پر بٹھائے رکھا جائے۔ یہی ہیں وہ لوگ جن کی طرف سے اس نظام نو کی طرف دعوت دینے والی ہر آواز کی مخالفت ہوگی۔ چونکہ اس زمانہ کی فضا میں، عہد کہن کے شخصی استبداد کو معیوب سمجھا جاتا ہے اس لئے سیاست حاضرہ کے تقاضے یہ ہیں کہ زبان سے تغلب و تفوق اور استیلاء و استبداد کی مخالفت کی جائے۔ لیکن نظام اس قسم کا قائم کیا جائے جس میں وہی تغلب و استیلاء موجود ہو۔ یعنی روح وہی ہے لیکن اس کے پیکر بدل چکے ہیں، لات و منات وہی ہیں فقط ان کے لباس میں تبدیلی آگئی ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام ۔۔۔ جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب ۔۔۔ تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآن، دولت و حشمت کی مخالفت نہیں کرتا۔ وہ کہتا یہ ہے کہ قوت و دولت کے غلط استعمال سے، (اور ہر اس نظام معاشرت میں، جو قرآنی خطوط پر متشکل نہ ہوگا، ان کا استعمال غلط ہوگا) انسانی کردار میں ایسے عیوب و اسقام پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے قرآنی اسلوب و انداز کی زندگی ان پر سخت گراں گذرتی ہے۔ اس لئے مترفین کا گروہ اس انقلاب کی مخالفت و مزاحمت میں ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

لہٰذا، پاکستان کے مسلمانوں کے سامنے یہ دوسرا مرحلہ، پہلے سے بھی زیادہ ہمت طلب اور حوصلہ آزما ہے۔ اگر انہوں نے اس باب میں جرأت و بسالت اور ثبات و استقامت سے کام نہ لیا تو زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکے گا کہ یہ بھی اسی قسم کی حکومت قائم کر لیں جیسی دنیا کی اور قومیں قائم کئے بیٹھی ہیں۔ لیکن یہ قرآنی استخلاف فی الارض نہیں ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنی حکومت بہرحال و بہرکیف، غیروں کی حکومت کے مقابلہ میں ہزار آئیں سودمند ہوتی ہے۔ اس لئے وہ زندگی، اس سے پیشتر کی زندگی سے یقیناً بہتر ہوگی۔ لیکن قرآنی زندگی نہ پہلی تھی، نہ یہ دوسری ہوگی۔ پہلی زندگی میں یہ معذوری تھی کہ ہمیں وہ امکانی مواقع کہاں میسر ہیں کہ ہم اپنے تصورات صحیحہ کے مطابق نظامِ حکومت قائم کر سکیں۔ لیکن اب امکانی قدرت کے میسر آجانے سے وہ بات تو باقی نہیں رہی۔ اب ہمارے پاس اس اعتراض کا کوئی معقول جواب نہ ہوگا کہ ہم نے اپنی زندگی کی عمارت کو قرآنی خطوط پر تعمیر کیوں نہ کیا۔ قرآنی نکتہ نگاہ سے حکومت، مبدل بہ استخلاف و "وراثت" اسی صورت میں ہوتی ہے جب وہ اس نظام کے قیام کا ذریعہ بنے جسے خالق کائنات نے نوعِ انسانی کے لئے تجویز کیا ہے اور جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ۝

یہ (صالحین) وہ لوگ ہیں کہ جب ہم انہیں تمکن فی الارض عطا کریں گے تو وہ نظام صلوٰۃ و زکوٰۃ کو قائم کریں گے، معروف کے احکام نافذ کریں گے اور منہیات سے روکیں گے۔ اور تمام امور آخرالامر خدا کیلئے ہوں گے۔

نظام صلوٰۃ و زکوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر، ایسی محیط کل اور ہمہ گیر اصطلاحات ہیں جن میں سے ہر ایک، اپنی تبیین و تشریح اور تفصیل و توضیح کے لئے مستقل ابواب کی محتاج ہے۔ اس وقت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ قرآنی نظام کی پوری کی پوری بساط حکومت ان ہی چاروں گوشوں کے اندر سمٹ کر آگئی ہے اور نظام صلوٰۃ ان میں عمودی

حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے مقام پر قرآن نے نظام صلوٰۃ کی اضاعت کو نعماء الٰہیہ کے چھن جانے کا موجب قرار دیا ہے۔ سورہ مریم میں دیکھئے منعم علیہ حضرات (علیہم التحیۃ والسلام) کے تذکار جلیلہ کے بعد فرمایا۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ (۱۹/۵۹)

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف جانشین ہوئے جنہوں نے نظام صلوٰۃ کو ضائع کر دیا اور اپنی خواہشات ہی کی اتباع کرنے لگ گئے۔ سو یہ ہلاکت و بربادی کو پالیں گے

یہی ہیں وہ جن سے استخلاف فی الارض کی سی نعمت عظمیٰ چھن جاتی ہے۔ اور کیسے سوختہ بخت ہیں وہ لوگ جن سے ایسی متاع عزیز اس طرح سے چھن جائے۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ

یہ ہے صالحیت پیدا کرنے کا نظام جس کا فطری نتیجہ وراثت ارض ہوتا ہے۔ اسے پیش نظر رکھئے اور پھر ایک نگاہ اپنے آپ پر ڈالیئے اور ایسا کرتے وقت بنی اسرائیل کی اس واژگوں بخت قوم پر بھی نگاہ رکھئے جس کے مقدرات کے ڈوبتے ہوئے ستارے ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں۔ ان کی یہ حالت تھی کہ ذرا سی تکلیف آئی اور وہ لگے بڑبڑانے۔ کوئی بات خلاف منشا پیش آگئی اور وہ بیٹھ گئے منہ لبسور کر۔ قدم قدم پہ یہ طعن کہ ہمیں خواہ مخواہ مصر سے نکال کر لے آئے۔ اس سے تو ہم قوم فرعون کی غلامی میں اچھے تھے! اور یہاں کیا حالت ہے؟ اگلے دنوں میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ کالی جھنڈیاں لئے۔ "پاکستان مردہ باد" کے نعرے لگاتے، جلوس کی شکل میں چلے جا رہے ہیں۔ ایک سے پوچھا کہ کیوں؟ کیا بات ہے؟ کہنے لگا۔ میاں! تین دن ہو گئے ہیں پانی کا نل بند پڑا ہے۔ کوئی سنتا ہی نہیں۔ جہنم میں گیا ایسا پاکستان۔ اور بھاڑ میں گئی اسلامی حکومت۔ کچھ وہاں مر گئے۔ جو باقی رہ گئے ہیں یہاں مارے جا رہے ہیں۔" دیکھئے! یہ داستان

کس طرح حرفاً حرفاً بنی اسرائیل کی داستان سے ملتی ہے اور قوم کس طرح ذرعاً ذرعاً اور شبراً شبراً ان کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ جس شخص سے بات کیجئے ایسا معلوم ہوگا گویا اس نے پاکستان میں آکر کسی کی ہفت پشت منہتا دنسل پر احسان عظیم کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قوم کو سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ لیکن ان مصیبتوں کی برداشت میں ان کی طرف سے کچھ اس قسم کی ذہنیت کا مظاہرہ ہو رہا ہے گویا یہ مصیبتیں، کسی اور کی خاطر مفت میں جھیل رہے ہیں۔ انہیں قطعاً اس امر کا احساس نہیں کہ انہیں ایک ملک عظیم عطا ہوا ہے تاکہ وہ اس پر اپنی حکومت قائم کریں اور اگر انہوں نے ان مصائب و تکالیف کو ہمت اور حوصلہ سے برداشت کر لیا تو دنیا بھر کی سرفرازیاں اور سربلندیاں اُن کے قدم چومیں گی۔ یہ تو عوام کا حال ہے۔ خواص کی یہ کیفیت ہے کہ وہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اس خطۂ زمین کے مل جانے سے سب کچھ مل گیا ہے اب کچھ کرنے کا کام باقی نہیں رہا۔ ہندوؤں کی یہ چندروزہ غوغہ آرائی ختم ہو جائے تو وہ تخت جہانداری و سریر جہانبانی پر کامل، امن و سکون سے متمکن ہو جائیں گے۔ وَذَالِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر　　　اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد

یاد رکھئے! یہ خطۂ زمین بجائے خویش کوئی شے نہیں۔ نہ یہ اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہے اور نہ ہی ہم اس کی مٹی میں دفن ہونے سے جنت الفردوس کے مستحق بن سکتے ہیں۔ یہ محفوظ اسی صورت میں رہ سکتا ہے کہ آپ اپنے خون سے اس کی حفاظت و صیانت کا سامان بہم پہنچائیں، اور پھر اس طرح محفوظ و مصئون ہونے کے بعد جنت ارضی میں اسی صورت میں متبدل ہو سکتا ہے جب آپ اپنے اندر صالحیت پیدا کر کے اس پر خدا کی حکومت کا تخت اجلال بچھائیں۔ وراثت ارض کا ابدی قانون صالحیت ہے اور خوف و حزن سے نجات و مصئونیت صرف اس کے لئے مقدر کی گئی ہے جو اپنے آپ کو قانون الٰہیہ کی حفاظت میں لے آئے اور اس طرح مصلح بن جائے۔

فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۳۵)

پس جو کوئی اپنے آپ کو قوانین خداوندی کی حفاظت میں لے آئے اور اپنے اندر صالحیت پیدا کرے اس کے لئے نہ کوئی خوف ہے نہ

وذالك الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔

تقسیمِ ہند کا آئینی پہلو

(قسطِ آخر)

قسطِ اول میں سلسلۂ کلام کا آغاز کرپس مشن (۱۹۴۲ء) سے کیا گیا تھا اور اس میں بتایا گیا تھا کہ برطانیہ نے اس وقت کس طرح پہلی مرتبہ مسلمانوں کے مطالبۂ علیحدگی کو آئینی مذاکرات کا جزو سمجھا اور اسے سیاسی سطح سے آگے بڑھا کر عملی سیاست میں باقاعدہ شامل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد مختلف مراحل طے کرتے کے بعد یہ سلسلہ برطانوی مشن کے اعلان مئی ۱۹۴۶ء کے حصہ متعلقہ تدوینِ آئین تک پہنچا تھا جہاں یہ واضح کیا گیا تھا کہ برطانیہ نے کس طرح مسئلہ ہند کے تعطل کو پاکستان کی اساس پر حل کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں ہم یہاں تک پہنچ چکے تھے کہ مسلم لیگ نے ۶ جون کو، مئی کا اعلان وائسرائے اور مشن کی اس ضمانت پر منظور کر لیا کہ اگر کانگریس نے اس مرتبہ تجاویز مسترد کر دیں تو مسلم لیگ کے تعاون کا فائدہ اٹھایا جائے گا اور وائسرائے مسلم لیگ کی مدد سے عارضی حکومت کی تشکیل کر لیں گے۔

قسطِ زیرِ نظر میں، جو اس مضمون کی آخری قسط ہے، اعلان جون کے حصہ متعلقہ تشکیل حکومت عبوری اور کو الف مابعد، بشمولہ اعلان پاکستان (۳ جون ۱۹۴۷ء) تک کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سے پاکستان کے پس منظر کی تکمیل ہو جاتی ہے اور اس کے حال اور مستقبل سے متعلق آئینی مسائل کے سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

---

۱۶ مئی کے وزارتی بیان کے شائع ہوتے ہی وائسرائے نے عارضی مرکزی حکومت کی تشکیل کے لئے قائدینِ لیگ و کانگریس سے مذاکرت و مراسلت شروع کر دی تھی۔ کوئی مفاہمت نہ ہونے کی صورت میں اس کے متعلق بھی وائسرائے کو اپنی تجویز پیش کرنا پڑی۔ تجویز مختصراً یہ تھی۔ وائسرائے نے چودہ اصحاب کو دعوت دی کہ وہ عارضی مرکزی حکومت میں شریک ہوں۔ ان کا تناسب یوں تھا: مسلمان پانچ، سورن ہندو پانچ،

سکھ ایک، اچھوت ایک، پارسی ایک، عیسائی ایک۔ مدعوین کے نام وائسرائے نے خود ہی منتخب کئے تھے۔ ناموں کے اعلان کے بعد اعلان میں تھا کہ

اگر یہ اصحاب ذاتی وجوہات کی بنا پر دعوت قبول کرنے سے قاصر ہوں تو وائسرائے مشورہ کے بعد دوسرے حضرات کو ان کی بجائے دعوت دیں گے۔

شعبوں کی تقسیم کا کام وائسرائے دونوں پارٹیوں کے لیڈروں کے مشورہ سے کریں گے۔

عارضی حکومت کی مجوزہ ترکیب فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے لئے مثال نہیں ہوگی۔ یہ ترکیب محض موجودہ مشکل کا حل اور بہترین امکانی مخلوط حکومت ہے۔

اگر دونوں پارٹیاں یا ان میں سے کوئی ایک پارٹی اس تجویز کے مطابق مخلوط حکومت کی تشکیل میں شرکت پر رضامند نہ ہوں، تو وائسرائے کا ارادہ ہے کہ وہ عبوری حکومت کی تشکیل کا کام جاری رکھیں گے اور ان کی زیادہ سے زیادہ نمایندگی حاصل کریں گے جو ۱۶ مئی کے اعلان کو قبول کرتے ہیں۔

مسلم لیگ کا مطالبہ مساوات نیابت یہ تھا کہ کانگرس اور لیگ کے نمایندے مساوی ہوں۔ یہ شرط وائسرائے نے قبول کرلی تھی اور ۱۶ جون کے اعلان سے پیشتر ایک ملاقات میں قائدِ اعظم سے عہد کر چکے تھے کہ عبوری حکومت بارہ ارکان پر مشتمل ہو گی اور ان کی ترکیب یوں ہوگی۔ مسلم لیگ پانچ، کانگرس پانچ، سکھ ایک، عیسائی (یا اینگلو انڈین) ایک۔ شملہ کا یہ عہد وائسرائے نے اس وقت بھی دہرایا جبکہ ۵ جون کو دہلی میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بدیں مقصد منعقد ہو رہا تھا کہ ۱۶ مئی کے بیان کے متعلق اپنی روش متعین کرے۔ قائد اعظم نے ۱۹ جون کو وائسرائے کو جو خط بھیجا اس میں صاف طور پر لکھا کہ وائسرائے کے اس عہد اور اس کے اعادہ نے مسلم لیگ کونسل کے فیصلہ قبولیت کو خاص طور پر متاثر کیا۔ بظاہر وائسرائے اس فیصلہ پر متحکم نظر آتے تھے لیکن ۱۳ جون کی ملاقات میں آپ نے قائد اعظم سے یہ اظہار کیا کہ وہ بارہ کی بجائے تیرہ ارکان کو شریکِ حکومت کریں گے۔ ایک کا اضافہ ایک اچھوت رکن سے ہوگا۔ ۱۳ جون کو یہ بات ہوئی اور ۱۶ جون کو وائسرائے نے جو اعلان کیا اس میں ایک اور اور رکن کا اضافہ ہوگیا اور مجموعی تعداد ارکان تیرہ سے بڑھ کر چودہ ہوگئی۔ اس نئے فارمولا میں مسلم لیگ اور کانگرس کی مساوات نیابت ختم کردی گئی اور مساوات مسلمانوں اور سوا ن ہندوؤں میں قائم کردی گئی۔ اس نام نہاد مساوات کی

حقیقت یہ تھی کہ پانچ مسلم لیگیوں کے مقابلہ میں چھ کانگرسی آ گئے۔ تین اقلیتی نمایندے مسلم لیگ کی قوتِ رائے کم کرنے کے لئے اور بٹھا دیئے گئے۔ لارڈ ویول ـــــ یا نام کی بجائے ہم وائسرائے کہیں ـــ اور برطانوی وزرا نے یہ پہلی اعلانیہ بدعہدی کی۔ ایک بدعہدی جس میں شملہ کے وعدہ اور اس کے اعادہ دہلی کی دوہری مخالفت ہوئی۔ بارہ ارکان کی تعداد غلط، تیرہ کی غلط ـــ آخر کار صحیح تعداد چودہ نکلی جو مسلم لیگ کے علم اور مشورہ کے بغیر طے پائی۔ اس بدعہدی میں وائسرائے پیرو تھے اور وزارتی مشن ان کے مؤید۔ ۱۶ مئی کو برطانوی اعلان شائع ہوا۔ ۱۶ جون کو یعنی پورے ایک ماہ بعد عبوری حکومت سے متعلق وائسرائے کا اعلان ہوا۔ اس ایک تاریخی مہینے میں کانگرس نے جو کچھ کیا اس کا ہلکا سا خاکہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ اس نے ۱۶ مئی کے اعلان کے متعلق اپنی روش واضح نہیں کی۔ نہ اسے قبول کیا، نہ مسترد کیا۔ بس وہ یہی تاریں ہلاتی رہی کہ مسلم لیگ کو کسی طریقہ سے شکست دی جائے۔ اس نے بات بات پر پہلو بدلے اور فیصلہ کو ٹالا۔ چنانچہ ۳۰ مئی تک کانگرس کے فیصلہ کا بے سود انتظار کر کے وائسرائے نے صدر کانگرس کو لکھا کہ مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ۵ تاریخ کو منعقد ہو رہا ہے اگر آپ بھی ۶ تاریخ کو اپنی مجلسِ عاملہ کو مجتمع کر کے آخری فیصلہ کر دیں تو آئندہ ہفتہ کے دوران میں متنازع فیہ مسائل کا حل ہو جائے۔ مسلم لیگ نے ۶ تاریخ کو اپنا فیصلہ بھی دیدیا اور کانگرس سازشوں میں مصروف رہی۔ ۲۰ جون کو یعنی ۱۶ جون کے اعلان کی اشاعت کے بعد وائسرائے نے صدر کانگرس کو لکھا کہ

> مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس حقیقت کا کما حقہ احساس ہوگا کہ وزارتی مشن کو انگلستان جا کر بہت سے ضروری امور سرانجام دینے ہیں اور وہ زیادہ دیر تک یہاں انتظار نہیں کر سکتے۔ لہٰذا میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجلسِ عاملہ سے کہئے کہ وہ ۱۶ جون کے اعلان سے متعلق اپنا فیصلہ جلد از جلد صادر کر دے۔

اس کے علاوہ وائسرائے نے متعدد مرتبہ زبانی یاددہانی کرائی۔ لیکن کانگرس، اقوامِ ہند کی اجارہ دار کانگرس نے پورے انتالیس دن محض باتوں میں گزار دیئے۔ ایک ایسا معاملہ جو ہندوستان کے آئندہ آئین سے متعلق تھا اور جس سے چالیس کروڑ انسانوں یعنی کرۂ ارض کے پانچویں حصہ آبادی کی قسمت وابستہ تھی، اس معاملہ میں کانگرس کی سنجیدگی اور تفکر کا یہ حال تھا کہ لاطائل دلیلوں اور وکیلانہ موشگافیوں میں انتالیس دن گذار دیئے ادھر یہ کھچڑی پک رہی تھی اور ہر باورچی اپنے اپنے فن کا حتی المقدور مظاہرہ کرتا تھا ادھر موجودہ ہندوستان کے

وزیر اعظم، پنڈت نہرو، کانگرس کے لاڈلے مگر بگڑے فرزند آئینی مذاکرات اور فیصلے ادھورے چھوڑ کر دہلی سے کشمیر پہنچ گئے کہ مہاراجہ سے یہ حق منوائیں کہ پنڈت صاحب کشمیر میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ادھیچے اور طفلانہ مظاہرں سے اپنی عزت افزائی کرا کے پنڈت جی خیر سے گھر کو آئے اور تصفیہ کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع کیا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔

کانگرس نے ۲۵ جون کو بالآخر اپنا فیصلہ دے ہی دیا۔ ۱۶ مئی کا اعلان جو آئندہ آئین سے متعلق تھا اسے کانگرس نے اپنی توجیہوں کے ساتھ منظور کیا اور ۱۶ جون کا عبوری دور سے متعلق اعلان مسترد کر دیا۔ یہ منظوری لفظاً منظوری تھی اور معناً نامنظوری۔ صوبائی تحزب جسے مشن، یعنی واضعین اعلان، جبری قرار دیتے تھے اسے کانگرس نے اختیاری قرار دیا اور اس توجیہ کے ساتھ اعلان مذکور قبول کر لیا۔ یہ توجیہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے غلط تھی۔ تحزب جبری تھا اور یہ تجویز کا اہم جزو تھا۔ اسے تنہا کانگرس بدل نہیں سکتی تھی۔ اس کے بدلنے کے لئے مسلمان ارکان کی بھی اکثریت درکار تھی۔ لیکن کانگرس نے مجلس دستور ساز کے انعقاد کا انتظار کیا، نہ مسلمانوں کی رضامندی حاصل کی۔ مشن جو کانگرس سے ملی بھگت کر چکا تھا اس نے اس کاغذی منظوری کو بھی شرف قبول بخشا۔ وہ تین مہینے سے ان مذاکرات میں الجھا ہوا تھا اور کامیابی گریز پا تھی۔ اسے انگلستان میں مخالف پارٹی کے سامنے بھی تو اپنی کارگذاری کو پیش کرنا تھی۔ مسلم لیگ دونوں اعلانات، متعلقہ آئندہ آئین و دور عبوری، تسلیم کر چکی تھی۔ کانگرس نے عبوری دور کی تجویز علانیہ مسترد کر دی تھی لیکن آئندہ آئین سے متعلق تجویز کو لفظی طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ برطانوی وفد اس نام نہاد منظوری کو دنیا بھر میں بالعموم اور انگلستان میں بالخصوص فخریہ پیش کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس بے حقیقت کارگذاری کا ڈھول پیٹنا چاہتا تھا کہ شدید و بنیادی اختلافات کے باوصف وہ مسلم لیگ اور کانگرس کو یہاں تک قریب لے آیا کہ دونوں نے ۱۶ مئی کا اعلان قبول کر لیا۔ گویا مجلس دستور ساز کی تشکیل و کارکردگی پر دونوں پارٹیاں متفق ہو گئیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ برطانوی وزراء نے اپنی غلط توقیر قائم رکھنے کے لئے دلیری، صاف گوئی اور دیانت سے کام نہیں لیا۔ وہ آہستہ آہستہ کانگرس کے سامنے جھکتے گئے جھکتے گئے تا آنکہ کانگرس ان کی پشت پر سوار ہو گئی۔ اگر وہ شروع سے کانگرس کو دلیرانہ جواب دیتے اور اسے ان حدود میں رکھتے جو انھوں نے متعین کی تھیں تو معاملات بلا تضیع اوقات اور بطریق احسن طے

پاجاتے اور یہ بظاہر لاینحل مسئلہ کب کا حل ہو چکا ہوتا۔

مسلم لیگ اور کانگرس کے فیصلے معلوم ہو جانے پر لازماً سوال پیدا ہوتا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ مسلم لیگ نے آئندہ آئین اور عبوری دور سے متعلق تجاویز کو قبول کر لیا تھا۔ اس کے برعکس کانگرس نے بال کی کھال اتار اتار کر جو فیصلہ شائع کیا وہ اسی غیر مصالحانہ اور تخریبی ذہنیت کا آئینہ دار تھی جس کا مظاہرہ تقدیر ہند کے لئے اتنا اہم فیصلہ کن دنوں میں اس نے بغایت اخری کیا تھا۔ اس نے ۱۶ مئی کا بیان اپنی توجیہوں کے ساتھ (نا) منظور کیا اور ۱۶ جون کا بیان نامنظور۔ وائسرائے اور مشن جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے اپنی ناکامی کا اتنا احساس رکھتے تھے کہ وہ اضطراراً انکوں کا سہارا لے رہے تھے۔ کانگرس کی مشتہر منظوری ایسا ہی سہارا تھی۔ یہ وقت تھا کہ مشن کانگرس سے واضح جواب طلب کرتا اور ان سے مطالبہ کرتا کہ وہ یا تو غیر مبہم طور پر ۱۶ مئی کے بیان کو تسلیم کریں یا مسترد کریں۔ مشن نے کانگرس کی اس منافقانہ رضامندی کو قبول کر لیا اور کانگرس نے مشن کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھایا۔ اگر اس وقت کانگرس کو غیر مبہم جواب دینے پر مجبور کیا جاتا تو بیشتر سیاسی فتنے ابدی نیند سو جاتے۔ بہرکیف مشن نے اسے منظوری فرض کرتے ہوئے آگے چلنا چاہا۔

کانگرس ۱۶ جون کا اعلان مسترد کر کے عبوری حکومت میں شرکت کی مستحق نہیں رہی تھی۔ وائسرائے نے مشن کی اجازت اور تائید سے مسلم لیگ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر کانگرس عبوری حکومت میں شریک نہ ہوئی، تو حکومت کی تشکیل و ترتیب ان عناصر سے کی جائے گی جو ۱۶ جون کے اعلان میں بیان کردہ خطوط و شرائط پر حکومت میں آنا پسند کریں گے۔ ۱۶ جون کے اعلان کا مشہور پیراجس کی متضاد و غیر معقول توجیہوں نے عام طوفان پیدا کر دیا مندرجہ ذیل ہے۔

> دونوں پارٹیوں یا ان میں سے کسی ایک کے ان خطوط پر مخلوط حکومت کی تشکیل پر رضامند نہ ہونے کی صورت میں وائسرائے کا ارادہ ہے کہ وہ ایسی عارضی حکومت کی تشکیل کا کام جاری رکھیں جو ان کی زیادہ سے زیادہ نمائندہ ہو جو ۱۶ مئی کا اعلان قبول کرتے ہیں۔

ان الفاظ کا مفہوم بالکل عیاں ہے۔ ان میں کوئی ابہام نہیں۔ ان الفاظ کو ان ضمانتوں سے ملا کر پڑھا جائے جو وائسرائے نے وقتاً فوقتاً مسلم لیگ کے صدر کو دیں تو یہ مفہوم اشتباہ اور ابہام سے یکسر پاک ہو جاتا ہے

اس پیرے کا مطلب اس کے علاوہ کچھ اور ہوتا تو ان ضمانتوں اور تسلیوں کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ کیا پیرا ۸ کے مصنفین کے ذہن میں غیر صلح جو "ایک پارٹی" مسلم لیگ تھی اور وہ اسی کی متوقع نارضامندی کا سد باب کرنا چاہتے تھے؟ اتنے عظیم اور تقدیر انگیز مذاکرات سے متعلق اس قسم کا سوال بداہتاً ناقابل اعتنا اور بازاری سا معلوم ہوتا ہے لیکن مخصوص پس منظر میں یہ ایک سنجیدہ سوال بن گیا۔ جس کا صرف مثبت جواب دیا جا سکتا تھا۔

بہرکیف مشن اور وائسرائے آگے بڑھے۔ عبوری حکومت کے لئے وہ کانگرس کا تعاون حاصل نہیں کر سکتے تھے اور ان کی بے تدبیری نے دوسری اہم سیاسی جماعت یعنی مسلم لیگ کا یقینی تعاون کھو دیا۔ محکم و ناقابل تردید مواعید کے باوجود ملک معظم کا نمائندہ ہند، وہ فوجی وائسرائے جس کی عسکری تربیت اعلیٰ سیرت اور خوش معاملگی کی ذمہ دار سمجھی جاتی تھی، صاف انکاری ہوگیا۔ وائسرائے کی وعدہ خلافی کو ملک معظم کی حکومت کے وزیروں اور جمہوریت کی گہوارہ اولین برطانوی پارلیمان کے نمائندوں نے حق بجانب قرار دیا

پاس عہد اور اخلاقی ذمہ داری کو بالائے طاق رکھ دینے میں ان مدعیان حق و صداقت . . . . اور واضعین تقدیر ہند کی ضمیر مردہ نے ذرہ بھر ملامت نہ کی۔ عین اس حال میں کہ دنیا بھر کی نظریں اس بدقسمت برصغیر اور وزرائے ملک معظم کی مساعی مصالحت پر لگی ہوئی تھیں اور برطانیہ اپنی بے غرضی، خلوص اور فرض شناسی کا یقین دلا رہا تھا یہ اخلاقی حادثہ پیش آیا۔ بہی خواہان ہند اس سیاسی فریب کاری اور دھوکہ بازی پر دم بخود تھے۔ ایک مسلم لیگ کو کاروبار حکومت سے بہرہ مند نہ کرنے کے خیال سے اخلاق، آئین اور قانون کے ابتدائی ضابطے سرپائے استغنا سے ٹھکرا دیئے گئے۔ مانا کہ کانگرس کو عبوری حکومت میں شریک نہ کرنا وقتی مصالح کے خلاف تھا اور مسلم لیگ کو مرکز پر مسلط کر دینا وقتی مصالح کے اور زیادہ خلاف۔ لیکن آئین و اخلاق کے مستقل تقاضے وقتی تقاضوں اور سیاسی مصلحتوں سے کہیں زیادہ قابل قدر اور گراں بہا ہوتے ہیں۔

زیر نظر پیرا ۸ میں تحریر تھا کہ اگر ایک پارٹی یا دونوں پارٹیاں عبوری حکومت کی مجوزہ تجویز (یعنی ۱۶ جون کے اعلان) سے متفق نہ ہوئے تو تشکیل حکومت اس انداز سے کی جائے گی کہ وہ ان کی زیادہ سے زیادہ نمائندہ ہو جو ۱۶ مئی کا اعلان قبول کرتے ہیں۔ ۱۶ مئی کا اعلان لیگ نے اور (لفظی طور پر) کانگرس نے تسلیم کر لیا تھا۔ جون کا بیان محض مسلم لیگ نے منظور کیا۔ اب تشکیل حکومت دو نو پارٹیوں سے مل کر ہو سکتی تھی کیونکہ دونوں نے مئی کا اعلان

قبول کر لیا تھا لیکن چونکہ کانگرس نے جون کا اعلان مسترد کر دیا تھا اور یہی اعلان عبوری حکومت سے متعلق تھا اس لئے اس کے عبوری حکومت میں شریک ہونے یا شریک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایسے میں تشکیلِ حکومت میں مسلم لیگ اور وہ عناصر آ سکتے تھے جو مئی کا اعلان قبول کرتے تھے۔ کانگرس خارج از بحث تھی۔

کیا مسلم لیگ کو پھانسنے کے لئے یہ چکمہ دیا گیا تھا؟ کیا اس گمراہ کن بیرے اور اس کی منافقانہ تشریح کی تصنیف اس لئے ہوئی تھی کہ مسلم لیگ کو سبز باغ دکھا کر اور مغالطہ میں ڈال کر اعلانات زیرِ نظر پر عمل پیرا کرایا جائے۔ ۲۷ر جولائی کو بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے فرمایا۔

> ۲۴ر جون کی رات کو کانگرس نے عبوری دور اور آئندہ آئین سے متعلق تجاویز کو یک قلم مسترد کر دیا تھا مگر ۲۵ کی صبح کو انتھک سر سٹیفورڈ کرپس بھنگی بستی گئے اور مسٹر گاندھی کو جگایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ چنانچہ لارڈ پیتھک لارنس کو مسٹر پٹیل کے سراغ پر چھوڑا گیا۔ وہ انھیں سڑک پر سے اچک کر گھر لے گئے اور وہاں منصوبہ تیار کیا۔ کانگرس کو آئندہ آئین سے متعلق تجویز منظور کر لینے کی ترغیب دی گئی۔ خواہ وہ اپنی توجیہوں کے ساتھ ہی ایسا کیوں نہ کرے۔ مشن نے کانگرس کو یقین دلایا کہ وہ عبوری حکومت کی تجویز ترک کر دے گا۔

اس فردِ جرم کی کوئی تردید نہیں کر سکا۔ در پردہ گھناؤنی سازشوں کا یہ ایک ضمنی گوشہ ہے۔ سرا پردہ سیاست کے اسرار مستقل داستان ہیں! حیرت آفریں!! نفرت انگیز!!!

جب مسلم لیگ اور کانگرس دونوں اعلانات پر غور کر رہی تھیں اور خدشہ تھا کہ وہ فیصلے کرنے میں غیر ضروری تاخیر نہ کر دیں تو اس وقت انھیں نا امیدگانِ جنگ انتظامی مصائب کی دہائی دی جاتی تھی اور اس نیم قحط کا واسطہ دیا جاتا تھا جو ملک میں اشیائے خوراک کی کم یابی اور گرانی سے وقوع پذیر تھا۔ ایک کانگرس کے انکارِ شرکت نے جملہ اشد مسائل کو بے حقیقت بنا دیا۔ وہ عجلت کے استدلالات سب دھرے رہ گئے اور ہوا تو یہ کہ گذشتہ تین مہینوں کی لگاتار محنت سے وائسرائے اور سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں پر جو بارِ گراں پڑا ہے اس کے پیشِ نظر مزید مذاکرات کچھ وقت کے لئے ملتوی کئے جاتے ہیں۔ ۲۶ر جون کو ہزایکسیلنسی وائسرائے نے اعلان کیا

اور تین دنوں کے بعد وائسرائے انگلستان عازمِ انگلستان ہو گئے۔ مذاکرات کے ازسرِنو شروع ہونے تک ایک نگراں (Caretaker) حکومت کا اعلان کر دیا گیا جو سراسر سرکاری حضرات (officials) سے مرکب تھی۔ یہ اقدام سراسر ناقابلِ فہم تھا۔ نام نہاد نگرانِ حکومت نے اس مجلسِ منتظمہ کو بھی ختم کر دیا جس کے ارکان ایوانِ حکومت سے باہر ایک حد تک قدر و منزلت سے دیکھے جاتے تھے اور وہ کسی حد تک بعض طبقات کے "غیر منتخب" نمائندے بھی تھے۔ لیکن ان کو جواب دے کر ایک ایسی 'حکومت' مرتب کر دی گئی جس کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور جو سوائے حکومت کے کسی کی نمائندہ نہ تھی۔ یہ غیر ذمہ دار اور خلافِ آئین حکومت اپنی ترکیب کے لحاظ سے ہی اہم مسائل کو نپٹا سکنے کی اہل نہ تھی۔ وہ قانونی اعتبار سے اس کی مجاز بھی نہ تھی۔ کاروبارِ حکومت کو یوں معطل کر دینے کی مصلحت کچھ ہندوستان کا فیلڈ مارشل وائسرائے ہی سمجھ سکا ہوگا!

تمام مسائل مہمہ کو گلدستہ طاقِ نسیاں بنا کر وائسرائے آرام گاہ میں تشریف لے گئے۔ استراحت فرمانے کے بعد آپ نے

دوزخ میں ڈالدے کوئی لیکر بہشت کو

کے مصداق "سنا اَن دیکھا نہ تاؤ" عارضی حکومت کا اہتمام و انصرام تنہا پنڈت نہرو کے سپرد کر دیا۔ اس دورانِ استراحت میں مسلم لیگ اور مسلمان غم و غصہ سے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ ان کی عزتِ قومی کو پامال کیا گیا تھا اور ان کے تعاون و اشتراک کا عملی استخفاف کیا گیا تھا۔ ہمہ گیر مطالبہ کے پیشِ نظر مسلم لیگ کونسل کا اجلاسِ بمبئی (۲۷-۲۹ جولائی) دہلی کی قرارداد رضامندی واپس کر چکا تھا اور آئینی جد و جہد کو بے اثر دیکھ کر عہد کر چکا تھا کہ ضرورت آپڑی تو مسلم لیگ تصادم (براہِ راست اقدام) سے گریز نہیں کرے گی۔

بدھر مسلم لیگ دل برداشتگی کے عالم میں بمبئی میں کونسل کے انعقاد کی تیاریوں میں مصروف تھی کہ وائسرائے کی بدعہدی اور مشن کے توہین آمیز رویہ کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنے فیصلہ دہلی پر نظرِ ثانی کرے، اُدھر ایوان ہائے حکومت اور کانگریس حلقوں میں سیاسی سازش بھرے انگڑائیاں لے رہی تھی۔ لیگ کے فیصلہ بمبئی نے راستہ صاف کر دیا۔ چونکہ مسلم لیگ نے اپنی قبولیت منسوخ کر دی تھی اس لئے وہ عبوری حکومت میں شرکت کی مستحق نہیں رہی تھی۔ اب اس کا استحقاق صرف کانگریس ہی کو حاصل تھا جو اپنے نقطۂ نگاہ سے

۱۶ مئی کے بیان کو مان رہی تھی۔ لہٰذا وائسرائے نے ایک اور حیرت زا اقدام کیا۔ انھوں نے پنڈت نہرو کو بحیثیت صدر کانگرس دعوت دی کہ وہ عبوری حکومت کی تشکیل کا اہتمام اپنے ذمہ لیں۔ پنڈت جی خوشی سے پھولے نہ سمائے کیونکہ اب صورت یہ نہیں تھی کہ وائسرائے ان کی فہرست اسمار سے انتخاب کرتا بلکہ اب ترتیبِ حکومت کی ساری ذمہ داری صدر کانگرس کی تھی۔ جو پڑ ۱۹۳۶ء میں ہانکی گئی تھی وہ لباسِ حقیقت اختیار کر رہی تھی۔ اور جو خواب گذشتہ دس سال سے دیکھا جا رہا تھا اور جسے عالمِ بیداری میں دیکھنے کے لئے راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی وہ آج متشکل ہو رہا تھا

جنگ کے دوران میں کانگرس نے برطانیہ کا یہ جواب کبھی تسلیم نہیں کیا کہ زمانہ جنگ اہم آئینی تبدیلیوں کے لئے موزوں نہیں۔ بلکہ وہ اسی ضد پر قائم رہی کہ اگر ان کا مطالبہ تسلیم کرنے کی یہی صورت ہے کہ آئین بنیادی طور پر بدل دیا جائے تو ایسا کر لینا چاہیئے۔ لیکن یہی کانگرس اس جدوجہد کے باوجود اب اس مرکزی حکومت کی قیادت و عنان سنبھال رہی تھی جو ۱۹۳۵ء کے نہیں بلکہ ۱۹۱۹ء کے قانونِ اصلاحات کے تحت عمل میں آئی تھی۔ کانگرس نے اس 'قبل از نوح' قسم کے دستور کو چلانا اسی لئے گوارا کر لیا کہ اب وہ مسلم لیگ کے بغیر حکومت مرتب کر رہی تھی۔ ابتدائے جنگ سے لے کر اب تک اس نے اصرار و تکرار سے مرکزی حکومت میں آنے سے انکار کیا وہ کسی نہ کسی بہانے سے اس ذمہ داری سے گریز ہی کرتی رہی۔ شاید اس لئے کہ وہ اس سے پیشتر مسلم لیگ کو الگ کر کے تنہا حکومت کی ذمہ داری نہیں لے سکتی تھی۔ آج جب اسے مسلم لیگ کے بغیر تشکیلِ حکومت کا موقع ملا تو اس نے تمام آئینی بحثیں اور قانونی بحثیں ختم کر ڈالیں اور بلا شرط عنانِ حکومت سنبھال لی۔ بعد کے واقعات نے اس قیاس کو ظنی نہیں رہنے دیا۔ کیونکہ جب بعد میں مسلم لیگ شریک ہو گئی تو طفلانہ وجوہات پر کانگرس نے استعفا دینے کے رعب دیئے اور نہایت سنجیدگی سے برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلم لیگ کو عارضی حکومت سے خارج کر دے۔

وائسرائے نے تنہا کانگرس کو دعوتِ تشکیل و ترتیبِ حکومت دے کر غیر ذمہ داری اور جانبداری کا افسوسناک مظاہرہ کیا۔ جون کے آخر میں بعینہٖ یہی پوزیشن تھی۔ البتہ اس وقت فرق یہ تھا کہ کانگرس آمادہ بہ تعاون نہ تھی۔ اب کانگرس کی بجائے مسلم لیگ کنارہ کش تھی۔ جو ذمہ داری ایک ماہ پیشتر تنہا لیگ کو نہیں دی جا سکتی تھی وہ آج تنہا کانگرس کو دی جا رہی تھی اور پوری ڈھٹائی اور بد سلیقگی کے ساتھ۔ مسلم لیگ کی قرارداد تصادم (یا براہِ راست اقدام) بالذات انکار نہ تھی۔ وہ نتیجہ تھی اس تسلسلِ واقعات کا کہ وائسرائے اور کانگرس جس کی کڑیاں تھے۔ ان واقعات سے

تانے بانے میں تینوں فریق شریک تھے۔ اس لئے کسی مقام پر پہنچ کر کسی ایک فریق کے اعمال و اقوال کو سارے پس منظر سے جدا کر کے اس پر تنقید کرنا اور اسے تنہا مجرم گردانتا خلاف دانش تھا۔ مسلم لیگ کی ناراضی متعلقہ تجاویز سے نہیں تھی بلکہ اس سلوک ناروا کے باعث تھی جو وائسرائے اور کانگرس نے روا رکھا۔ مسلم لیگ جن تجاویز کو دہلی میں صحیح یا غلط طور پر تسلیم کر چکی تھی انہی تجاویز کو یونہی مسترد کرنا کہاں کی دانشمندی تھی۔ ان تجاویز میں تو کچھ ردوبدل نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا ظاہر کہ مسلم لیگ وائسرائے اور کانگرس کی ملی بھگت کے خلاف احتجاج کر رہی تھی اور بس۔ ضمناً ہم سمجھتے ہیں کہ مسلم لیگ نے ازراہِ امن پسندی اور حفاظت جوئی دہلی میں تجاویز منظور کرنے میں عجلت سے کام لیا۔ اس کا معتدبہ طبقہ استرداد کے حق میں تھا۔ قدم اول پر ہی اگر ان تجاویز کا تجزیہ کر کے اور مالہٗ و ماعلیہ پر بحث کر کے مناسب تحفظات کا مطالبہ کیا جاتا (کانگرس کی طرح ؟) مشروط قبولیت روا رکھی جاتی تو انسب تھا۔ کیونکہ اس صورت میں بمبئی میں فیصلہ منسوخ کرنے کی ضرورت نہ پڑتی بلکہ انہی شرائط کو دہرا کر اپنے اصلی مطالبہ اور فیصلہ پر قائم رہا جا سکتا تھا۔ اگر مسلم لیگ یہ روش اختیار کرتی تو ایک تو کانگرس کی منافقت کا مناسب جواب ہوتا دوسرے بمبئی کے فیصلہ تنسیخ کے بعد وائسرائے کے ہاتھ میں یہ حربہ ہرگز نہ آتا کہ چونکہ مسلم لیگ نے ۱۶ مئی کا اعلان نامنظور کر دیا ہے اس لئے اب اسے شرکت حکومت کی دعوت نہیں دی جا سکتی۔ اس مسلسل مشروط رضامندی سے یا تو لیگ اور کانگرس دونوں مستحق حکومت ہوتیں یا دونوں 'راندہ' متصور کی جاتیں۔ کم از کم وائسرائے، کانگرس سے کوئی امتیازی سلوک کرنے کا بہانہ نہ تلاش کر سکتے۔

پنڈت نہرو نے متکبرانہ انداز سے قائداعظم کو دعوت دی کہ وہ ترتیب حکومت میں ان سے تعاون کریں قائداعظم نے اس دعوت کو ٹھکرا دیا۔ نہرو یہ دعوت دینے والے کون ؟ چنانچہ کانگرس نے ایک عبوری مرکزی حکومت زیر سرکردگی پنڈت نہرو مرتب کی جو ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو برصغیر ہند پر مسلط ہو گئی۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ یوم سیاہ تھا۔ ترپن ایام سیاہ گزرنے پائے تھے کہ مسلم لیگ نے وائسرائے کی دعوت پر کانگرس سے سمجھوتہ کئے بغیر اپنے پانچ نمائندے مرکزی حکومت میں بھیج دیئے۔ یہ شرکت عبوری دور کی تجویز مسترد کر دینے کے باوجود ہوئی — کانگرس نے وائسرائے کی مجلسِ منتظمہ میں آ کر جو مسلم کش حکمتِ عملی روا رکھی اس کے پیشِ نظر یہ ضروری ہو گیا کہ حقوق کے تحفظ اور کانگرسی ریشہ دوانیوں کے سدباب کے لئے حکومت میں اپنے نگہبان مقرر کئے جائیں۔ اس

فیصلہ سے مرکزی حکومت دو احزاب میں بٹ گئی۔ ایک حزب کانگرس تھا اور دوسرا حزب مسلم لیگ۔ آئینی تاریخ میں یہ 'دو قومی' اور 'غیر مخلوط' وزارت اپنی مثال نہیں رکھتی۔ اس عجوبہ وزارت نے اندرون و بیرونِ حکومت کیسے کام چلایا؟ یہ داستان دلچسپ ہے مگر ہمارے موضوع سے خارج۔

عارضی حکومت کے بن جانے سے نگاہیں پھر آئندہ آئین کی تدوین پر مرکوز ہو گئیں۔ مسلم لیگ اور کانگرس میں مفاہمت کے کوئی امکانات نہیں تھے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ اگر دونوں جماعتیں حکومت میں شریک ہو جائیں تو باہمی تعاون سے ان کے اختلافات کم ہو جائیں گے اور وہ ایک دوسرے سے تعاون کرنا سیکھ جائینگی لیکن ایوانِ حکومت میں یک جا ہو کر وہ ایک دوسرے سے اور دور ہو گئیں اور آئندہ آئین کا مسئلہ پھر لاینحل نظر آنے لگا۔ اس اثناء میں قائدِ اعظم نے اس رائے کا اظہار کیا کہ سارے معاملہ پر از سرِ نو غور کیا جائے اور لندن میں نئی کانفرنسوں کا آغاز کر کے معاملہ سلجھایا جائے۔ انھوں نے مزید کہا کہ وائسرائے نے جو کچھ کیا اس کے پیشِ نظر وہ محض اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کی خاطر لندن جانے کے لئے تیار نہیں۔ بلکہ اگر برطانوی حکومت از سرِ نو گفتگو کے لئے مجھے دیگر فریقین کے ہمراہ لندن آنے کی دعوت دے تو میں منظور کر لوں گا۔ اس تجویز کا خاطر خواہ اثر ہوا اور لندن میں کانفرنس کا آغاز کر دیا گیا جس میں قائدِ اعظم، لیاقت علی خاں، پنڈت نہرو اور بلدیو سنگھ شریک ہوئے۔

مرکزی حکومت میں آ کر کانگرس نے مجلس دستور ساز کے انعقاد کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ مسلم لیگ اپنے فیصلہ پر قائم تھی۔ اس نے اعلان کر دیا کہ وہ بحالاتِ موجودہ مجلسِ مذکورہ میں شرکت کے لئے تیار نہیں۔ ۱۶ مئی کے اعلان کے مطابق مسلم لیگ کے بغیر مجلسِ دستور ساز کے انعقاد کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا مگر کانگرس اپنی ضد پر قائم تھی اور انگریز اس کی پشت پر تھا۔ مجلس کا انعقاد کانگرس کے نزدیک وقار کا سوال بن گیا تھا۔ وہ اس انعقاد کو اپنی فتح اور لیگ کی شکست متصور کرتی تھی۔

یہ تیاریاں ہو رہی تھیں کہ لندن سے دعوت آئی۔ کانگرس اس اثنا میں اعلان کر چکی تھی کہ (بریدہ اور غیر آئینی) مجلس دستور ساز ۹ دسمبر کو منعقد ہو گی۔ لندن کانفرنس کی نوعیت اور معاملہ کی غیر معمولی نزاکت کے پیشِ نظر اس مجلس کا انعقاد چند دنوں کے لئے ملتوی بھی کیا جا سکتا تھا۔ اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پنڈت نہرو اس میں اس وقت شریک ہوں جب لندنی کانفرنس کسی ایک فیصلہ پر پہنچ جائے۔ لیکن وہ کانفرنسوں سے دامن چھڑا کر ۹ دسمبر سے پہلے دہلی پہنچ گئے۔

انگلستانی مذاکرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک معظم کی حکومت نے فیصلہ دیدیا کہ مسلم لیگ کا نظریہ صحیح تھا اور کانگرس کا غلط۔ یہ فیصلہ ۶ دسمبر کو شائع ہوا۔ یہ محض شق تحزب سے متعلق وضاحت و تشریح ہی نہیں تھی بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر ایک نئی بات پیدا کر دی گئی۔ اس اعلان کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(قائدینِ ہند کے مابین) اہم وجہ نزاع صوبائی فریقوں سے متعلق ہے۔ وزارتی وفد کی شروع سے ہی یہ رائے رہی ہے کہ متفق علیہ صورت کی عدم موجودگی میں فریقوں کے فیصلے کثرت رائے سے طے پائیں۔ مسلم لیگ نے یہ رائے تسلیم کر رکھی ہے مگر کانگرس نے مختلف رائے کا اظہار کیا ہے ان کا دعویٰ ہے کہ اعلان کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ صوبوں کو تحزب اور آئین دونوں کے متعلق خود فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔

ملک معظم کی حکومت نے قانونی رائے حاصل کی ہے جو وزارتی مشن کی رائے کی موید ہے۔ اعلان کا یہ حصہ ۱۶ رمئی کی تجویز کا اہم جزو ہے۔ اسی پر مبنی آئین کو ہی حکومت برطانیہ پارلیمان میں پیش کرنے پر رضامند ہوگی۔ لہٰذا مجلسِ دستور کی جملہ پارٹیوں کو چاہیے کہ وہ اسے تسلیم کر لیں۔

ظاہر ہے کہ اور توجیہی امور بھی پیدا ہوں گے۔ چنانچہ ملک معظم کی حکومت امید کرتی ہے کہ اگر مسلم لیگ کی کونسل مجلس دستور ساز میں شریک ہو جائے تو وہ اس پر بھی اتفاق کریں گے کہ جیسا کانگرس کا خیال ہے وہ توجیہی امور کسی ایک پارٹی کے ایما پر فیڈرل کورٹ میں وضاحت کے لئے پیش کئے جائیں اور اس کے فیصلے قبول کر لئے جائیں۔

بیش نظر اختلافی مسئلہ سے متعلق ملک معظم کی حکومت کانگرس سے تاکیداً کہتی ہے کہ وہ اسے تسلیم کرے تاکہ مسلم لیگ کے لئے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کا راستہ صاف ہو جائے۔ اگر اس کے باوجود مجلسِ دستور ساز کی خواہش ہو تو یہ بنیادی معاملہ فیصلہ کے لئے فی الفور فیڈرل کورٹ میں پیش کر دیا جائے۔

مجلس دستور ساز کی کامیابی کا مدار متفقہ لائحہ عمل پر ہے۔ اگر ایسا آئین مرتب ہو گیا جس میں ہندی آبادی کے کسی کثیر طبقہ کو نمائندگی نہیں دی گئی تو ملک معظم کی حکومت اس آئین کو نارضامند

علاقوں پر مسلط کرنے پر تیار نہیں ہوگی۔

اس اعلان کی تمہید میں کہا گیا تھا کہ مذاکرات کا مقصد یہ تھا کہ مجلس دستور ساز میں تمام متعلقہ پارٹیوں کا اشتراک و تعاون حاصل کیا جائے۔ چونکہ مجلس کے کاروبار میں محض مسلم لیگ ہی شریک نہیں ہو رہی تھی اس لئے ان کانفرنسوں کا مقصد یہی تھا کہ کسی طریقہ سے مسلم لیگ کو شرکت پر رضامند کیا جائے۔ یہ رضامندی بآسانی حاصل کی جا سکتی تھی اور اس کی ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ کانگرس ۱۶ مئی کے اعلان کو صحیح معنوں میں تسلیم کر لیتی۔ مسلم لیگ کے نزدیک اس وقت اعلانِ مئی مردہ اور ناقابلِ احیا ہو چکا تھا۔ وہ اسے اساس مفاہمت بنانے کے لئے تیار نہیں تھی — کانگرس کی مسلسل روش نے اس کی رائے کو اور مستحکم کر دیا گیا۔ مذاکرات نے ایک اور ثبوت بہم پہنچا دیا کہ کانگرس اپنی روش پر نظرثانی کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ۲۰ دسمبر کے اعلان سے مترشح ہوتا ہے کہ کانگرس کو اس کی غلطی — خطرناک غلطی — کا احساس دلانے کی اس سے زیادہ کوشش نہیں کی گئی کہ اسے یہ کہہ دیا گیا کہ اس کی روش غلط ہے۔ اس روش کو غلط قرار دینے کے جو آئینی نتائج برآمد ہوتے تھے برطانوی وزارت نے انھیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اگر کانگرس کی توجیہ غلط بلکہ مشن کی توجیہ سے بخطِ مستقیم برعکس تھی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ کانگرس نے ۱۶ مئی کا اعلان تسلیم نہیں کیا تھا۔ اسے حتمی طور پر کہا جا سکتا تھا کہ اس کی توجیہ غلط ہے، لہٰذا اس کا دعویٰ کہ اس نے اعلانِ مذکورہ تسلیم کر لیا ہے غلط ہے۔ اور چونکہ اعلانِ مذکورہ پر اس وقت تک عمل درآمد مشکل ہے جب تک کہ متعلقہ فریق اس میں اشتراک و تعاون نہیں کرتے لہٰذا بحالاتِ موجودہ وہ اعلان ساقط العمل ہے۔ لیکن اس دلیرانہ روش کا مظاہرہ نہیں کیا البتہ اس دلیری کی تلافی دوسری صورت سے کر دی گئی۔ برطانیہ کی حکمتِ عملی اس ضمن میں بین بین سی رہی۔ وہ نہ تو کانگرس کو قطعی جواب دے سکا اور نہ مسلم لیگ کی مخالفت کا استخفاف کر سکا کانگرس کی روش غلط قرار دے دینے کے باوجود اس نے مجلسِ دستور ساز کے انعقاد کی مخالفت نہیں کی اور نہ ایسا مشورہ ہی دیا۔ یہ ذکر کر کے بھی کہ اس نے اپنے قانونی مشیروں سے استصواب کر لیا ہے حکومتِ برطانیہ نے کانگرس کو یہ رعایت دے دی کہ اگر وہ اب بھی رضامند نہیں تو وہ اپنے خیال کے مطابق اس معاملہ کو بھی فیڈرل کورٹ میں پیش کر دے۔ آئینی اعتبار سے یہ اجازت دینا زیادتی تھی۔ کیونکہ خود اعلانِ مئی کے مطابق اعلان کی اساسات کو عدالت میں نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔ صوبائی تحریب محکماتِ اعلان میں سے تھا اور اس کا مفہوم صرف ایک تھا۔

حکومت برطانیہ اس طرح اعلانِ مئی کی حدود سے تجاوز تو کر گئی لیکن بطور اتمامِ حجت یہ تجاوز مفید رہا۔ اس سے کانگرس کی پوزیشن اور کمزور ہو گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ حکومتِ برطانیہ اس سے مرعوب ہو کر جھکنے کے لئے تیار نہیں، یا وہ مجبور ہے کہ یوں نہ جھکے۔ جس معاملہ میں واضعین اعلان ایک رائے رکھیں اور برطانوی حکومت کے قانونی مشیر اس رائے کی تصدیق کریں اس معاملہ میں کانگرس مختلف رائے رکھ کر فیڈرل کورٹ میں کیا کامیابی حاصل کر سکتی تھی؟ فیڈرل برطانوی حکومت کے قانونی مشیروں کی رائے کو کہاں تک غلط قرار دے سکتی تھی؟ کانگرس نے باوجود اپنے ادعا کے اس مسئلہ کو فیڈرل کورٹ میں پیش نہیں کیا۔

اس اعلان نے کانگرس کو پابند کر دیا اور مجبور کر دیا کہ وہ مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرے اور اسے مجلسِ دستور ساز میں شریک کرے تاکہ ایسا منصفانہ آئین تیار کرے جسے حکومتِ برطانیہ بآسانی پارلیمان میں پیش کر سکے کیونکہ اس اعلان میں صاف تحریر تھا کہ

> (. . . تاکہ) ہندوستانی ایسا آئین مرتب کر سکیں جسے ملک معظم کی حکومت پارلیمان میں پیش کرنے پر رضامند ہو۔ لہٰذا اس آئین پر مجلس دستور ساز کی تمام پارٹیوں کا اتفاق ہونا چاہیے۔

نیز یہ کہ

> اگر آئین ایسی مجلس دستور ساز نے مدون کیا جس میں ہندی آبادی کے کسی کثیر طبقہ کو نمایندگی نہ دی گئی تو ملک معظم کی حکومت اس آئین کو نارضامند علاقوں پر مسلط کرنے پر تیار نہیں ہو گی۔

اس کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ اگر مسلم لیگ مجلسِ دستور ساز میں شریک نہ ہوئی تو اس غیر آئینی اور بریدہ مجلس کا مدون کیا ہوا قانون ان علاقوں پر مسلط نہیں کیا جائے گا جہاں مسلمان آباد ہیں۔ بالفاظ صحیح تر ہندوؤں کا آئین ان صوبوں میں نافذ نہیں ہو گا جنہیں پاکستان کہا جاتا ہے۔ اتنے واضح انتباہ کے باوجود کانگرس نے اپنی روش پر نظرِ ثانی نہ کی اور وہ خودسری سے اندھا دھند اسی راہ پر گامزن رہی۔ وہ بظاہر اکھنڈ ہندوستانی آمریت کی طرف جا رہی تھی لیکن وہ مزعومہ منزل پر پہنچی تو اس کی چشمِ تحیر و تحسر نے دیکھا کہ وہ اکھنڈ ہندوستان کی بجائے پاکستان پہنچ گئی ہے۔

مسلم لیگ کانگرسی روش کے پیشِ نظر مجلسِ دستور ساز سے عدم تعاون جاری رکھنے میں حق بجانب تو تھی ہی

اب چونکہ کوئی ایسے آثار نہیں تھے کہ کانگرس کی نگاہ کے زاویوں میں تبدیلی پیدا ہوگئی ہے یا وہ اب مسلم لیگ کے تعاون کی طلبگار رہے اس لئے اس نے عدم تعاون جاری رکھا۔ اعلانِ دسمبر نے اس کے ہاتھ اور مضبوط کر دیئے تھے۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں برطانوی حکومت نے یہ اعلان کیا تھا کہ ملک معظم کی حکومت کسی ایسے آئین کے حق میں دستبردار نہیں ہوگی جو اقلیتوں کو نظر انداز کر دے۔ کانگرس نے اس منصفانہ اور صحیح حکمت عملی کو ناپسند کیا بلکہ اسے ٹھکرایا۔ وہ اس وقت سے بدستور حقائق کا بطلان کرتی رہی اور اپنی آمریت کے قیام کے لئے عجیب و غریب وکٹیں کرتی رہی۔ سنہ ۱۹۴۲ء کی کرپس تجاویز کو اس نے بدیں وجہ ٹھکرایا کہ برطانوی حکومت نے مسلمانوں کے جائز حق کو ضمناً تسلیم کیا اور ایسی گنجائش پیدا کی کہ کم از کم کاغذی طور پر ہی صوبوں کی علیحدگی کا حق تسلیم کر لیا گیا۔ منزلِ پاکستان کا یہ دوسرا سنگِ میل تھا۔ منزلِ پاکستان ہنوز دور تھی، ایسی دور کہ بعض ـــ اور یہ بیشتر وابستگانِ کانگرس تھے ـــ اسے موہوم سمجھتے تھے۔ تاہم قدم اسی منزل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں مسٹر گاندھی کی تائید سے راجگوپال اچاریہ نے ایک فارمولا[۱] پیش کیا جس میں ضلع وار پاکستان کے "جراثیم" تھے۔ اس فساد نیت کے باوجود جس نے سنہ ۱۹۴۰ء اور سنہ ۱۹۴۲ء میں امکاناتِ مفاہمت کو کالعدم کر دیا کانگرس ـــ کسی نہ کسی شکل میں ـــ پاکستان تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئی۔ راجہ فارمولا اسی کتمان و تلبیسِ حق کا مظاہرہ تھا۔ سنہ ۱۹۴۵ء کی شملہ کانفرنس میں پھر کانگرس نے حقائق سے آنکھیں بند کیں اور دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی مردود کوشش کی۔ بند یا نیم وا آنکھوں سے یہ طائفہ اسی منزل کی جانب بڑھا جسے وہ وادیٔ ممنوعہ سمجھتا تھا۔ سنہ ۱۹۴۶ء کے سیاسی مذاکرات نے کانگرس کی نوازش کے صدقہ میں پاکستان کی طرف حقیقی قدم اٹھایا۔ پاکستان سامنے دکھائی دینے لگا حتیٰ کہ مسلمان حتم و یقین کے طفیل دس سال تک کا انتظار ناقابلِ برداشت سمجھنے لگے۔ وہ بے تابی سے اپنی دس سال کی مساعی کا ثمرہ ہاتھ میں لے لینا چاہتے تھے۔ کانگرس نے مسلمانوں کا اضطراب کم کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ بھارت ماتا اور اکھنڈ ہندوستان کو دسمبر سنہ ۱۹۴۶ء تک تو لے ہی آئی تھی لیکن اسے یہاں رکنے نہیں دیا۔ جس شمشیر تقسیم کو وہ نیام میں ڈال کر گنگا برد کر دینا چاہتی تھی اسے اس نے غیر ارادی طور پر صیقل کرنا شروع کر دیا۔

۱؎ ہم نے قصداً اس فارمولا اور اس کی پیشرو "تفریحی پیشکش" (Sporting Offer) کو حیطۂ بحث سے خارج رکھا ہے۔ کیونکہ یہ بے ضابطہ اعلانات اس غیر سنجیدگی اور طفلانہ انداز سے سامنے آئے تھے کہ انہیں سنجیدہ جائزے کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا۔

برطانیہ کے ہاتھ میں پوری طرح دے دینے سے پیشتر اس شمشیر کی تیزی و برندگی کا تجربہ ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو کیا گیا مسٹر اٹیلی وزیر اعظم برطانیہ نے دارالعوام میں اعلان کیا۔

ملک معظم کو یہ دیکھ کر از حد افسوس ہوتا ہے کہ ہندی سیاسی جماعتوں میں ابھی تک ایسے اختلافات موجود ہیں جن کے باعث مجلس دستور ساز مطلوبہ عمل و کارگذاری سے معذور رہے۔ . . .

موجودہ دورِ تذبذب پر از خطرات ہے اور غیر معین عرصہ تک جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ ملک معظم کی حکومت یہ وضاحت کر دینا چاہتی ہے کہ یہ ان کا حتمی ارادہ ہے کہ وہ ایسی تاریخ تک جو جون ۱۹۴۸ء سے متاخر نہ ہو اقتدار ذمہ دار ہندی ہاتھوں میں منتقل کر دے گی۔

لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس معین تاریخ تک مکمل نمائندہ مجلس دستور ساز کوئی (متفقہ) آئین مدون نہیں کر سکے گی تو ملک معظم کی حکومت اس پر غور کریگی کہ برطانوی ہند کی مرکزی حکومت کے اختیارات معین تاریخ تک کس کے سپرد کئے جائیں۔ (یعنی) آیا وہ مکمل طور پر برطانوی ہند کی کسی مرکزی حکومت کو دیدیئے جائیں یا بعض علاقوں میں موجودہ صوبائی حکومتوں کو یا کسی اور طریقہ سے جو معقول ترین نظر آئے اور جس میں باشندگانِ ہند کا بہترین مفاد ہو۔

انتقالِ اقتدار کا عمل جاری ہو جانے پر ۱۹۳۵ء کے قانونِ ہند پر عمل درآمد ندریجاً مشکل ہوتا جائے گا لہٰذا انتقالِ اقتدار کے لئے مناسب اور بروقت قانونی تبدیلی کی جاتی رہے گی۔

ملک معظم کی حکومت جن نمائندوں کے حق میں اقتدار منتقل کرنے کی تجویز کریگی ان سے انتقالِ اقتدار سے پیدا ہونے والے معاملات سے متعلق معاہدے مرتب کرے گی۔

اس انتقال کی ذمہ داری سے لارڈ ویول وائسرائے ہند کو سبکدوش کر دیا گیا اور ان کی بجائے لارڈ مونٹ بیٹن کے تقرر کا فیصلہ ہوا جنہیں ہندوستان کا آخری وائسرائے اور گورنر جنرل کہا گیا۔

اس اعلان میں کانگرس کا ایک اور مطالبہ پورا کیا گیا۔ وہ ایک عرصے سے متمنی تھی کہ ہندوستان کی آزادی کی تاریخ مقرر کر دی جائے۔ برطانیہ اب تک اس تعین سے گریز کرتا چلا آ رہا تھا اور یہی انسب بھی تھا۔ لیکن اب کانگرس کی مسلسل غیر مصالحانہ اور تخریبی روش نے یہ اعلان ناگزیر کر دیا تھا۔ اس دورِ تذبذب کو

اور پنجاب اسمبلی کی بیشتر سکھ نشستوں پر قابض ہو گئے۔ برطانیہ بوساطت گلینسی (گورنر پنجاب) اور ہندو کانگرس کی سازش سے خضر حیات کی قیادت میں وزارت قائم ہوئی جو کانگرس، اکالی، یونینسٹ جیسے متضاد عناصر سے مرکب تھی۔ ان میں قدر مشترک مخالفت مسلم لیگ تھی۔ اس وزارت کی شکست پر سکھ کو اور آگے بڑھایا گیا۔ مارچ میں کانگرس نے تارا سنگھ کی تلوار بے نیام کی اور پنجاب میں قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ کانگرس نے اس خون و آتش کے کھیل کو اعلانیہ سودا بازی کا وسیلہ بنایا اور تقسیم پنجاب کا مطالبہ کر دیا۔ ان فسادات کے بغیر نہ سکھ قطعی طور پر مسلمانوں کے دشمن بن سکتے تھے نہ تقسیم کی کامیابی کے امکانات روشن ہو سکتے تھے۔ چنانچہ تنہا پنجاب کی تقسیم کا سوال اسی لئے پیدا کیا گیا کہ سکھ اس سبز باغ کی پر فریب بہار میں الجھے رہیں جس کی حیثیت خائے پائے خزاں سے زیادہ نہ تھی اس وقت سکھوں نے پاکستان میں مؤثر اقلیت کی بجائے وہ قطرۂ آب بننا گوارا کر لیا ہے جس کی عشرت فنا کا بے پایاں سامان "بحرِ ہند" میں موجود ہے۔

ایک اور قرارداد میں کانگرس نے مطالبہ کیا کہ انتقالِ اقتدار کے لئے یہ ضروری ہے کہ عبوری مرکزی حکومت کو نوآبادیاتی حکومت تسلیم کیا جائے۔ نیز اسے مکمل طور پر بااختیار اور ذمہ دار کابینہ کی حیثیت دی جائے۔ عبوری مرکزی حکومت میں کانگرس اور مسلم لیگ بطور حلیف و معاون نہیں بلکہ بطور حریف و مخالف شامل تھیں۔ حکومت کے فیصلے متفقہ یا کثرتِ رائے سے نہیں ہوتے تھے۔ یعنی حکومت کی اجتماعی ذمہ داری مفقود تھی اور خود کانگرس برطانوی حکومت سے درخواست کر چکی تھی کہ مسلم لیگ کو حکومت سے خارج کر دیا جائے یہ آئینی طرز کی مخلوط وزارت نہیں تھی۔ ایسی وزارت کو کابینہ قرار دینا آئینِ جمہوریت سے تلعب ہوتا۔

ان متضاد قراردادوں کے ہوتے ہوئے کانگرس کی دعوتِ ملاقات بے معنی تھی۔ تقسیم پنجاب کی قرارداد صریحاً وزارتی مشن کے اعلان کی نقیض تھی۔ حالانکہ اب تک اساسِ مفاہمت وہی اعلان تھا۔ خود کانگرس نے اس نشست میں اس امر کا اقرار کیا کہ وہ اسی اعلان پر کاربند ہے اور اس کی مجلسِ دستور ساز اس اعلان کے مطابق مصروفِ عمل ہے۔ ایسے میں مسلم لیگ کی طرف سے اس دعوت کے قبول کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

سیاسی تعطل جوں کا توں رہا تا آنکہ تقسیم کی وہ منزلِ آخریں آپہنچی جس کا اعلان ۳ جون کو ہوا اور جس میں ہم اس وقت داخل ہیں۔

قابض تھی۔ اور یہ خدشہ تھا کہ تقسیم کی قرارداد آراء کی کثرت حاصل نہیں کر سکے گی۔ اور کسی ایک اسمبلی کے فیصلہ پر تقسیم کا مدار اس لئے رکھ دیا گیا کہ دونوں صوبوں میں ایک ایک اسمبلی ہندو اکثریت کی مالک تھی۔ یہ دوسرا مذاق تھا۔ اس سے کہیں بہتر ہوتا کہ تقسیم کا قطعی فیصلہ دے دیا جاتا اور حد بندی مجلسِ تحدید کے سپرد کی جاتی۔ اس غیر جمہوری طریقہ کو جمہوریت کا لباس پہنا کر بزعم خود جائز اور حق بجانب بنا دیا گیا۔

تقسیم کا فیصلہ کرنے سے پیشتر ان صوبوں کی غیر منقسم مجلسِ مقننہ کا ایک اجلاس ہوتا تھا جس میں یہ طے ہوتا تھا کہ اگر صوبہ تقسیم نہ ہوا تو وہ کس مجلس دستور ساز میں شامل ہوگا۔ (یعنی پاکستانی مجلس میں یا ہندوستانی مجلس میں)۔ ان شرائط میں تقسیم پنجاب و بنگال ناگزیر تھی۔ کیونکہ اگر فیصلہ پاکستانی مجلس کے حق میں ہوتا تو ہندو اور سکھ اسمبلی ضرور تقسیم کا فیصلہ کرتی۔ بصورتِ دیگر یہی فیصلہ مسلمان اسمبلی کر دیتی اور اعلان زیرِ نظر کے مطابق کسی ایک اسمبلی کے فیصلے سے تقسیم لازمی ہو جاتی۔

مجلسِ تحدید کے سپرد یہی کام تھا کہ وہ آبادی کے لحاظ سے ملحق مسلم اور ملحق غیر مسلم علاقے متعین کرے۔ تحدید کا اصل الاصول آبادی تھا۔ البتہ مجلس کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ "دیگر عوامل" کو بھی ملحوظ رکھے۔ ان عوامل میں اقتصادی اور انتظامی تقاضے آسکتے تھے۔ مگر ان معصوم الفاظ میں ملکِ معظم کی حکومت نے زہریلے نشتر پنہاں رکھے تھے۔ مسٹر ایٹلی نے دارالعوام میں یہ غیر معقول اور فتنہ انگیز بیان دیا کہ سکھوں کی نازک پوزیشن کے پیشِ نظر ان کو زیادہ علاقہ دیا جائے گا۔ لارڈ مونٹ بیٹن وائسرائے ہند نے ایک اخباری ملاقات میں یہ غیر معتدل بات کی کہ گورداسپور کا ضلع سکھوں کے حوالہ کیا جا سکے گا۔ مسٹر آرتھر ہینڈرسن نائب وزیر ہند نے ایک موقع پر کہا کہ "دیگر عوامل" سے مراد سکھ گوردوارے ہیں۔ یہ بھانت بھانت کی بولیاں ان در پردہ سازشوں کو منکشف کر رہی تھیں جو اس اعلان کے پس منظر تھیں۔ غیر جانبداری اور عدل کے تقاضے بالائے طاق رکھ دیئے گئے تھے اور برطانیہ اعلانیہ طرفداری سے کام لے رہا تھا۔ اعلانیہ طرفداری شاید اتنی قابلِ مذمت نہ ہوتی جتنی در پردہ سازشیں مردود تھیں۔ یہ مخفی سازشیں رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں اور جب ان کے نتائج ظاہر ہوئے تو انسانیت مظلوم و بے کس انسانیت دریائے خون میں غرق تھی اور اخلاق ماتم کناں تھا۔

اعلانِ جون میں پاکستان کے ایک ایک صوبہ سے خصوصی برتاؤ کیا گیا۔ پنجاب اور بنگال کو تقسیم کر دیا گیا۔

مسلم لیگ آسام کا بھی مطالبہ کر رہی تھی۔ اس میں سے صرف سلہٹ کا ضلع کاٹ کر مشرقی بنگال کے ساتھ ملا دیا گیا۔ سر سرل ریڈکلف نے اپنی طرف سے مزید قطع و برید کی اور پنجاب، بنگال اور سلہٹ کے کئی حصے جن میں مسلمان نمایاں اکثریت کے مالک تھے اور مسلم اکثریت کے علاقوں سے وہ علاقے متصل اور ملحق تھے غیر مسلم علاقوں کے ساتھ ملا دیئے گئے۔ ظلمی تقسیم عارضی تھی۔ وہ کم و بیش ہو سکتی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے "کم" ہوئی اور ہندوؤں کے لئے "بیش"۔ ظلمی تقسیم نے جو علاقے ہندوؤں کے سپرد کئے اس میں سے ایک انچ زمین بھی نہیں نکالی گئی حالانکہ مسلمانوں کے حصے میں ضرور کمی کر دی گئی۔

صوبہ سرحد سرزمین بے آئین مشہور تھا۔ اصلاحات عطا ہو جانے پر بھی یہ سرزمین بے آئین ہی رہی۔ کانگرسی دورِ اقتدار نے بے آئینی کو اور استحکام بخشا۔ اب انگریز کے ساتھ ہندو بھی تھا۔ تازہ انتخاباتِ عامہ نے سرحدی اسمبلی میں کانگرس کو اکثریت بخشی تھی۔ انتخابات کے بعد حالات ایسے بدلے کہ سرحد کے غیور پٹھان کانگرسی وزارت کے دشمن بن گئے اور انھوں نے اسے اکھاڑ پھینکنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس صوبہ میں کانگرس اسمبلی کے ایوان میں اکثریت کی مالک ضرور تھی لیکن بیرونِ ایوان عوام میں وہ اپنا اعتماد ضائع کر چکی تھی۔ گورنر اور وائسرائے کو اس ہمہ گیر ناراضی کی طرف توجہ دلائی گئی۔ وائسرائے نے ایک مرتبہ اس معاملہ کو ہاتھ میں بھی لینا چاہا لیکن پنڈت نہرو کی حکومت نے سرحد میں کانگرسی وزارت کی شکست کو گوارا نہ کیا۔ وائسرائے خاموش ہو گئے۔ صوبہ بھر میں حکومت کے خلاف بغاوت شروع ہو گئی۔ فروری کے تیسرے ہفتہ سے سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو گئی۔ اور اب تک بدستور جوش و خروش سے چل رہی تھی، حکومت کا کاروبار معطل ہو چکا تھا۔ وزارت ذلیل و ناکام ہو چکی تھی۔ بے جان سلیمان لاٹھی ٹیکے کھڑا تھا۔ انگریز کانگرس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا کہ یہ مردہ زندہ ہی نہیں صحت مند بھی ہے جون کے اعلان نے اس عصا کو کرمِ خوردہ کیا۔ صوبہ سرحد پر استصواب کی پابندی لگائی گئی۔ اسے استصوابِ عامہ میں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ہندی مجلسِ دستور ساز میں شامل ہو یا پاکستانی مجلسِ دستور ساز میں۔ ایسا ہی استصواب سلہٹ میں بھی روا رکھا گیا۔ وائسرائے نے یہ استصوابات اپنی نگرانی میں کرائے اور یہی مسلم لیگ کا مطالبہ تھا سرحد اور سلہٹ دونوں پاکستان میں شامل ہو گئے۔

صوبہ سندھ مسلم صوبہ ہے۔ اس کی مسلم آبادی ستر فی صدی سے اوپر ہے۔ کراچی کے پرشور اور غوغا آور

ہندو ایک گمنام گوشہ کو 'ہندوستان' بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ وہی ہندو جو ایک مقامی ہندو اخبار کے اسی ضمن میں کہے ہوئے الفاظ کے مطابق رائی کا پہاڑ بنا سکتے ہیں، یہ بے سروپا باتیں کر رہے تھے۔

اس شور و شغب سے متاثر ہو کر سندھ پر بھی پابندی لگائی گئی کہ وہ اپنی مجلس مقننہ کے ایک خصوصی اجلاس میں یہ فیصلہ کرے کہ وہ ہندوستانی مجلس میں شامل ہوگا یا پاکستانی مجلس میں۔ سندھ جو چند ماہ قبل دوبارہ انتخابات کے موقع پر غیر لیگی اکا دکا جمعیت خاکِ نامرادی میں ملا چکا تھا۔ وہ صوبہ جس نے اس سے پیشتر اس سے کم مسلم کثریت کے باوجود اسمبلی کے ذریعہ پاکستان کا مطالبہ کیا تھا، اسی صوبہ سندھ کو یہ زحمت دی گئی کہ انتخابات کے بین نتائج کے باوصف یہ فیصلہ کرے۔ اس عجیب اور غیر ضروری پابندی کے جواز میں کہا جا سکتا ہے کہ اس سے ہندو پروپیگنڈہ کا مسکت جواب دینا مقصود تھا۔ ہو سکتا ہے لیکن کیا اس صوبہ میں علیحدگی کا ہندوآنہ مطالبہ بے سروپا اور خلافِ عقل نہ تھا؟ تیس فی صدی ہندو جو کسی حصہ میں بھی اکثریت نہیں رکھتے تھے اور اگر رکھتے بھی تو وہ علاقہ ہندوستان سے متصل نہ ہوتا ان کی علیحدگی یعنی چہ! اس قسم کے فرقہ دارانہ جزیرے تو خارج از بحث تھے۔

بلوچستان ابھی تک اصلاحات سے ہمکنار نہیں ہوا۔ برطانوی مشن نے اس علاقہ کو ایک نمائندہ مجلس دستور ساز میں بھیجنے کی اجازت دی تھی۔ یہ نمائندہ مسلم لیگ کی تتبع میں شریک مجلس نہیں ہوا۔ اس کے باوصف اس صوبہ سے بھی یہ دریافت کیا جانا ضروری سمجھا گیا کہ یہ کس مجلس میں شامل ہوگا۔

یہ امر بدیہی طور پر حیران کن معلوم ہوگا کہ یہ پابندیاں محض مسلم صوبوں اور علاقوں پر عائد کی گئیں لیکن سارے پس منظر میں دیکھنے سے اس کی علت بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں صوبہ بہار کے مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا اس کا آئندہ کے لئے سدباب کرنے کے خیال سے مسلمانوں نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ صوبہ میں مسلمانوں کی متفرق آبادی کو زیادہ سے زیادہ طور پر یکجا کر دیا جائے تاکہ ایسے موقعوں پر وہ اپنی منظم مدافعت کر سکیں۔ یہ مطالبہ حقیقی خدشات اور صحیح تجربات پر مبنی تھا اس کے باوجود صوبہ بہار پر یہ پابندی عائد نہ کی گئی کہ وہ بھی اپنی اسمبلی کے خصوصی اجلاس میں ہندوستان یا پاکستان میں سے کسی ایک کو منتخب کرے۔ علیٰ ہذا القیاس مغربی یوپی کے مسلمان بھی علیحدگی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس صوبہ پر کسی قسم کی شرط عائد نہیں کی گئی۔ یہ ظاہر ہے کہ مسلمان صوبوں نے وہی فیصلے دیئے جو مسلمان چاہتے تھے۔ مگر ان کے فیصلوں کو پہلے ہی سے کیوں فرض نہ کر لیا گیا

جیسا کہ ہندو صوبوں کے سلسلہ میں کیا گیا؟

بہرکیف مسلمان نے صبر و تحمل سے کام لیا اور اپنی ذمہ داریوں کا کما حقہ احساس رکھتے ہوئے بہ صمیم قلب فیصلہ قبول کر لیا۔ ہندوؤں کی طرف سے پنڈت نہرو نے اور سکھوں کی طرف سے بلدیو سنگھ نے بھی اعلان مذکورہ کو قبول کر لیا۔ لیکن ان کی قبولیت میں کہاں تک دیانت اور صداقت تھی اس کا فیصلہ بعد کے حادثات نے کیا۔ کانگرس عادتِ مستمرہ کے مطابق منافقت کی روش پر ہی قائم رہی۔ اس نے دل سے تقسیمِ ہند کو قبول نہیں کیا۔ وہ بدستور اس امر کی خواہشمند ہے کہ پاکستان پھر سے ہندوستان میں جذب ہو جائے۔ اس نے اس خواہش کو رازداری میں نہیں رکھا۔ اس کے دل سے ہوک اٹھتی ہے اور وہ بے بسی اور بے چارگی سے چلا اٹھتی ہے کہ پاکستان کی علیحدگی ہمالیہ جیسی عظیم غلطی ہے۔ چنانچہ اب ہندوستان کی خارجہ حکمت عملی اسی منفی اساس پر چل رہی ہے کہ پاکستان بطیبِ خاطر واپس نہ آئے تو اسے فتح کیا جائے۔ اس کے برعکس مسلمان کی روح قومی قائدِ اعظم کے منہ سے یہ اعلان کرا چکی ہے کہ

پاکستان قائم ہو چکا ہے اور انشاء اللہ قائم رہیگا۔

ولو کرہ الکافرون!

قرآنی تعلیم

(علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی)

اس وقت دنیا کے مسلمانوں پر مصیبتوں کی جو گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں ان کے اسباب و علل سے ہم آئندہ کسی مقالہ میں بحث کریں گے۔ آج ہم صرف اپنے ہندوستانی مسلمان بھائیوں کی حالت پر نظر ڈالنی چاہتے ہیں۔

ہمارے اوپر جو آفتیں ٹوٹی ہیں یا ٹوٹ رہی ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی حالت کو گہری نظر سے دیکھیں اپنے دین اور اپنے اسلام کا جائزہ لیں، اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ان آفتوں کے اسباب کیا ہیں۔ صرف ظاہری اسباب میں الجھ کر نہ رہ جائیں بلکہ معنوی اسباب پر بھی غور کریں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سربلند معزز اور حکمراں رکھنے کے حتمی وعدے فرمائے ہیں۔ پھر یہ کیا ہوا کہ ہمارے اسلافِ کرام پر اللہ تعالیٰ نے جو انعام و اکرام کئے تھے وہ سب ہم سے چھین لئے اور عذابوں اور رسوائیوں میں ہم کو مبتلا کر دیا؟ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کے وعدے غلط نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ اس نے خود فرمایا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۝

اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

اس لئے یہ یقینی ہے کہ ان نگوں بختیوں کے اسباب خود ہمارے ہی اندر ہیں اور ہمارے عقائد اور اعمال ایسے ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے ہمارا صحیح مسلمان ہونا اللہ کے نزدیک مسلّم نہیں رہا۔

قرآن کریم کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہمارے جرائم بہت ہیں۔ سب سے بڑا جرم ہمارا تو اجتماعی ہے کہ مدتہائے دراز سے ہم نے ملت کی وحدت کا خیال نہیں رکھا اور دینی اور سیاسی ہر لحاظ سے ہمارے علماء اور سلاطین ملت کا شیرازہ بکھیرتے رہے۔ یہاں تک کہ پوری امت کا تقریباً ۴/۵ حصہ کفر و شرک سے مغلوب اور غیروں کا محکوم ہو گیا۔ لیکن یہ بیان ایک مفصل توضیح کا محتاج ہے جس کو ہم آئندہ لکھیں گے۔ اس اجتماعی خرابی کے علاوہ عام مسلمانوں

میں غلط رہنمائی سے شرک و بدعت نے راہ پالی۔ حقائق قرآنی سے بے خبر ملاؤں اور پیروں نے اپنی اپنی تعلیمات اور اپنی اپنی پیدا کی ہوئی بدعات کے حجابات اللہ کی تعلیمات پر ڈال دیئے اور توحید کو جو اسلام کی اصل بنیاد ہے جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ آج کیفیت یہ ہے کہ دنیا کا ہر مسلمان زبان سے تو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ پر اور اس کی وحدانیت پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن عملاً لاکھوں اور کروڑوں مسلمان اس حی و قیوم مالک عرش بریں کے علاوہ زیر زمیں بہت سے "خدا" بنائے ہوئے ہیں۔ وہ ان اولیاء اور صلحاء امت کے مزاروں کو جن کو وہ مقبولین بارگاہ سمجھتے ہیں اپنا حاجت روا اور مشکل کشا مانتے ہیں۔ وہاں جا کر مرادیں مانگتے ہیں، مصیبت سے نجات، بیماری سے صحت اور اولاد اور تجارت کی کامیابی کی درخواستیں کرتے ہیں۔ بہت سے بزرگوں کے سالانہ عرس کرتے، ان کی قبروں پر چڑھاوے چڑھاتے، نذرانے گزارتے، منتیں مانتے اور شرکیہ رسوم بجا لاتے ہیں۔ اور ان کو امور طبیعی اور عالم مادی میں متصرف سمجھ کر اللہ کا شریک گردانتے اور شرک کے مرتکب ہوتے ہیں جو ایسا گناہ ہے کہ کبھی بخشا نہیں جا سکتا۔ قرآن نے بار بار تصریح کی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ

اللہ اپنے ساتھ شریک بنانے کے گناہ کو ہرگز نہیں بخشے گا اور اس کے سوا اور جس کو چاہیگا بخشے گا۔

یہ تو مشرکوں کے متعلق فرمایا ہے اور جو شخص ایمان لا کر شرک کرے اور اللہ کی توحید کا اقرار کرنے اور کلمہ پڑھ لینے کے بعد بھی دوسروں کو اس کا ساجھی سمجھے وہ تو اور بھی بڑا مجرم ہے۔ اس کے لئے بخشائش تو کجا اس کے سارے اعمال ہی اکارت ہو جاتے ہیں۔ سورۂ زمر میں ہے۔

وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔

تمہاری طرف بھی اور تم سے پہلے جو تھے ان کی طرف بھی وحی کی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو ضرور تمہارے اعمال اکارت ہو جائیں گے اور تم خسارہ میں رہو گے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ سے بتوں کو نکال کر پھنکوا دیا اس دن شیطان اس سے مایوس ہو گیا کہ ان کی امت سے بت بچوا سکے گا۔ اس لئے اس نے دوسرے راستہ سے ان کو شرک میں پھنسایا۔ یعنی

بزرگانِ دین کی محبت اور عقیدت ان کے دلوں میں اس قدر بھر دی کہ وہ ان کو اپنے اور اپنے معبود کے درمیان واسطہ بنانے لگے۔ حالانکہ بت پرست بھی یہی کہتے تھے جیسا کہ قرآن نے ان کا مقولہ نقل کیا ہے۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى

ہم ان (دیوتاؤں) کو صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ سے قریب تر کر دیں۔

قرآن نے انبیاءؑ اولیاء اور مقربینِ بارگاہ کے مدارج بیان کئے ہیں اور ان کی مقبولیت اور بزرگی بھی ظاہر کی ہے۔ ان کی تعظیم ممنوع نہیں ہے۔ لیکن تعظیم اور ہے اور بندگی اور ہے۔ ان میں سے کسی میں کوئی خدائی طاقت قرآن نے نہیں تسلیم کی ہے نہ ان میں سے کسی کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اللہ کے شریک یا سفارشی سمجھے جائیں۔ کافروں کے عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۱۰/۱۸)

اور وہ اللہ کے سوا ان کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کو ضرر پہنچا سکتے ہیں نہ نفع اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔ کہدو کہ کیا تم اللہ کو ان کے ذریعہ سے خبر پہنچاتے ہو جن کو آسمان اور زمین کی کسی شے کا علم نہیں ہے۔ اللہ پاک اور بالاتر ہے ان سے جن کو وہ شریک گردانتے ہیں۔

عالمِ برزخ جس میں شہداء کے سوا باقی مردے رکھے جاتے ہیں قرآن کے نزدیک مطلق عالمِ ممات ہے جس میں حیات کا کوئی شائبہ نہیں۔ ان اولیاء اور بزرگانِ دین کی بابت جن کو لوگ پوجتے ہیں قرآن میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (۱۶/۲۱)

اور جن کو وہ اللہ کے ماسوا پکارتے ہیں وہ کوئی شے پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں۔ وہ مردہ ہیں زندہ نہیں ہیں اور (اتنی بھی) خبر نہیں رکھتے کہ کب اٹھائے جائینگے

اس آیت میں جن معبودانِ ماسوا اللہ کا ذکر ہے وہ بت یا شجر یا شمس یا قمر وغیرہ بے جان چیزیں نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کے لئے نہ اموات کا لفظ مستعمل ہو سکتا ہے نہ احیاء کا۔ بلکہ یہ وہی بزرگانِ دین ہیں جن کو لوگ مقبولِ بارگاہ اور متصرف

مان کر پوجتے ہیں۔ دوسری آیت میں اس امر کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ۔ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ (۴۶/۵)

اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کے سوا ان لوگوں کو پکارتا ہے جو قیامت کے دن تک بھی اس کو جواب نہیں دینے کے۔ اور وہ ان کی پکار سے بے خبر ہیں۔ اور جب لوگ حشر کے لئے اٹھائے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی پرستش کا انکار کر دینگے۔

اس سے جہاں اس بات کی تصریح نکلی کہ معبودانِ غیر اللہ پکارنے والوں کی پکار سے بے خبر ہیں وہاں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ معبودیت وغیرہ بے جان چیزیں نہیں ہیں بلکہ بزرگانِ دین اور مقبولینِ بارگاہ ہیں جن کی وہ پوجا کرتے ہیں اور جو قیامت کے دن ان کی پرستش کا انکار کر دیں گے۔ کیونکہ بے جان چیزوں میں انکار کی قدرت نہیں۔ تیسری آیت میں ان معبودان غیر اللہ یعنی بزرگانِ دین کی سماعت کا انکار ہے۔

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ۔ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ۔ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ (۳۵/۱۴)

اور اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں ہیں۔ تم اگر ان کو پکارو گے تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے۔ اور جو سنتے بھی تو جواب نہ دیتے اور قیامت کے دن تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے۔

اس انکار کی کیفیت قرآن نے کئی جگہ بیان کی ہے۔

وَاِذَا رَاَى الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ۔ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۶/۸۶)

اور جب مشرکین (میدانِ حشر میں) اپنے شرکاء کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ اے ہمارے رب یہی وہ شرکاء ہیں جن کو ہم تیرے سوا پکارتے تھے۔ وہ (شرکاء) ان کو جواب دیں گے کہ تم بالکل جھوٹے ہو۔

دوسری جگہ ہے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ

دوسری خرابی جو ملت میں پیدا ہوئی وہ یہ ہے کہ اخوتِ اسلامی اور باہمی مساوات مٹ گئی ہے۔ اللہ نے جملہ مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی قرار دیا ہے اور قرآن میں فرمایا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ مسلمان تو سارے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

جس طرح اسلامی اخوت نسلی، لسانی اور ملکوں کی جغرافی حدود سے بالاتر ہے اسی طرح اس میں دولت و غربت کا بھی امتیاز نہیں۔ سب آپس میں مساوی اور برابر ہیں۔ سب کے حقوق ایکساں ہیں۔ بزرگی اور شرافت کا مدار خود انسانوں کے ذاتی عمل اور تقویٰ پر ہے۔ جو متقی اور صالح العمل ہو وہ بزرگ ہے خواہ غریب ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن مسلمانوں میں بادشاہت، ریاست، جاگیرداری اور تعلقہ داری نے جو مدتہائے دراز سے چلی آرہی ہیں امیر و غریب اور شریف و رذیل کے طبقات بنا رکھے ہیں جس سے اسلامی اخوت مٹ گئی ہے اور متفقہ قوت ٹوٹ گئی ہے۔

اس مصیبت اور ابتلائے عام میں ہر مسلمان کو سمجھنا چاہیئے کہ اللہ نے جس طرح ایک باپ کے دو بیٹوں کو بھائی بنا دیا ہے اسی طرح ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی قرار دیا ہے خواہ وہ کسی ملک، کسی نسل اور کسی قوم کا فرزند ہو۔ مختلف ملکوں یا مختلف نسلوں یا مختلف پیشوں سے اللہ کی بنائی ہوئی اس برادری میں فرق نہیں آتا۔ کیونکہ کلمہ پڑھ لینے کے بعد ہر آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں داخل اور آپ کا معنوی فرزند ہو جاتا ہے۔ یوں تو سرورِ عالم کسی مرد کے باپ نہ تھے جیسا کہ قرآن نے فرمایا ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہ تھے۔

لیکن اس سے جسمانی باپ مراد ہے۔ ورنہ آپ ساری امت کے جو قیامت تک ہوگی روحانی باپ ہیں، اور آپ کی ازواجِ مطہرات ساری امت کی مائیں۔ اس طرح ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان کے ساتھ اخوت کا رشتہ روحانی ہے جو اللہ کا مقرر کیا ہوا ہے۔ اس کو جسمانی رشتہ سے کم مقدس نہیں سمجھنا چاہیئے۔

پہلی خرابی دینی ہے جس سے توحیدِ الٰہی مٹ گئی جس پر اسلام کی بنیاد ہے۔ اور دوسری خرابی تمدنی ہے جس سے وحدتِ امت جاتی رہی جو اسلام کی اصلی طاقت ہے۔ اس لئے ہر مسلمان کو ان خرابیوں کی اصلاح میں پوری قوت کے ساتھ کوشش کرنی چاہیئے۔

اقبال اکادمی

پاکستان کے پہلے بجٹ میں محترم وزیر خزانہ نے ۴۹-۱۹۴۸ء کے لئے ایک لاکھ روپے کی رقم بدیں غرض منظور کی ہے کہ اقبال اکادمی کا قیام عمل میں لایا جاسکے۔ وزیر خزانہ نے یہ پیشکش کرتے ہوئے کہا:۔

اس شخص کی یاد میں جس نے عہدِ حاضر میں، فکرِ اسلامی میں انقلاب بپا کردیا، جس نے ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم پھر سے ماضی پر فخر کرسکیں اور مستقبل سے پرامید ہوسکیں، جس نے ہمیں قومی وراثت، ثقافت اور مقصد کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا، وہ پہلی شخصیت جس نے پاکستان کا تصور پیدا کیا، میری مراد علامہ اقبال سے ہے، ان کی یاد میں میں نے آئندہ سال کے بجٹ میں ایک لاکھ روپے کا پہلا عطیہ شامل کیا ہے۔ تاکہ ایک اکادمی قائم کی جائے جو ان کے نام سے منسوب ہو۔ یہ تفصیلات کہ یہ رقم عملاً کیسے خرچ کی جائے ایوان کے مشوروں سے طے پائیں گی۔

ہمیں خوشی ہے کہ حکومت نے ایک اہم ملی فریضہ کی طرف توجہ دی۔ ہم اشاعت ماسبق میں، وزیر خزانہ کی اس تجویز پر ہدیہ تبریک پیش کرچکے ہیں۔ ہم اس تجویز کا تہ دل سے خیر مقدم کرتے ہوئے چند گذارشات ضروری سمجھتے ہیں۔

اقبال کی عظمت الفاظ اور یادگاروں سے ماوراء ہے۔ نبوغ انسانی (human Genius) بہت کم اتنی دریا دلی سے کام لیتا ہے۔ اقبال ان چند نابغات سے ہے جو ارتقائے ذہنِ انسانی کی شاہراہ پر یقینی سنگہائے میل ہیں۔ مسلمانوں میں اقبال کی شخصیت اس اعتبار سے اور ممتاز ہوجاتی ہے کہ اس کا سرچشمۂ فکر قرآن تھا۔ قرآن کی "مئے بے دُردو صاف" میں جس بے دردی سے انسانی خیالات کی رنگ آمیزی کی گئی ہے اس نے قرآن کو قرآن نہیں رہنے دیا تھا۔ اتنی عظیم الشان آلائش سے آب مصفا

منقطع کر لینا کسی اقبال کا ہی کام ہو سکتا تھا۔ اقبال کا کلام قرآن ہی کا ترجمان ہے اور ہر قسم کی آمیزش سے پاک۔

اقبال چاہتے تو اظہارِ مافی الضمیر کا کوئی اور وسیلہ بھی اختیار کر سکتے تھے مگر مزاج مشرق کو بخوبی پہچانتے ہوئے انھوں نے شاعری کو ذریعہ بیان بنایا۔ چونکہ فطرت کی کرم گستریوں نے طبع میں موزونیت نہایت بلند ودیعت کی تھی اس لئے وہ اپنی مخصوص اور غیر معمولی افتاد سے اس میدان میں دیگر رفقاءِ شعر کو ہزاروں فرسنگ پیچھے چھوڑ گئے۔ چنانچہ محض شاعری کی جہت سے مطالعہ کیا جائے تو کلامِ اقبال چاشنی اور لطافت میں بے نظیر اور یکتا ہے۔ شاعری کو اظہارِ بیان کا ذریعہ اختیار کرتے ہوئے اقبال بے خبر نہ تھے کہ طبع مشرق ذریعہ کو مقصود سمجھ لینے پر مجبور ہوگی۔ چنانچہ انھوں نے قدم قدم پر یاد دہانی کرائی کہ ان کا مقصد شاعری نہیں بلکہ وہ اس موہبتِ عظمیٰ کو جہانِ چارسو میں عام کر دینا چاہتے ہیں کہ جس کا مہبط ان کا قلب ہے۔ انھیں کئی بار اعلان کرنا پڑا کہ انھیں شاعر کہنا ان پر تہمت لگانے کے مترادف ہے۔ انھوں نے بارہا تردید کی کہ وہ شاعر نہیں۔ انھوں نے 'حضور رسالت' شکایت کی:

من اے میرِ امم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزلخوانے شمردند

لیکن ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے، یار لوگوں نے اقبال کو غزل خواں ہی سمجھا، مصافِ زندگی میں "لہو ترنگ" سے گریز کر کے "نوائے چنگ" کے طلب کرنے والے شعر و سخن کی رنگینیوں سے آگے نہ نکل سکے چنانچہ یہ رنجدہ حقیقت ہے کہ اقبال کو شاعر ہی سمجھا جاتا ہے اور شاعری کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے، اقبال کے اٹھ جانے کے بعد جو کچھ اقبال کے متعلق کہا یا لکھا گیا ہے اسے ایک نظر دیکھ لینے سے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ایک مرحوم شاعر کا تذکرہ ہے جس کی طبیعت دقیانوسی بحور و عروض میں مقید رہی اور جو گل و بلبل کی سطحی اور بے معنی تشبیہات تک محدود رہا۔ البتہ شور و سوز دروں سے اس کے کلام میں لذت مقابلتاً زیادہ ہے۔ کسی نے اس سے زیادہ اقبال فہمی کا ثبوت دیا تو سنہ ۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت کا حوالہ دیدیا کہ جس میں پاکستان بحیثیت ایک سیاسی تصور کے پیش کیا گیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جو اقبال سے شغف

پیدا ہوا ہے تو اس کا مظاہرہ یوں دیکھنے میں آرہا ہے کہ بعض فلمی گیتوں کی جگہ اقبال کے شعروں نے لے لی ہے یا بعض ریڈیو "آرٹسٹ" اپنے فن کی مشق علامہ مرحوم کے اشعار پر کرتے ہیں۔ اس سطح بینی اور کور نگہی کا ثبوت اس قوم کی طرف سے مل رہا ہے جسے اقبال نے زمانہ کی تقدیریں بدلنے کے لئے منتخب کیا تھا۔

یہ عظیم الشان لغزش امر اتفاقی نہیں بلکہ اس سطحیت اور عامیت کی مظہر ہے جس کے ہم زبوں صید اور دیرینہ شکار ہیں۔ اس پس منظر میں محترم وزیر خزانہ کی اقبال اکادمی کی تجویز ہمیں اندیشہ ہے کہ اس سے آگے نہیں بڑھے گی کہ اقبال کے کلام کے حسین و جمیل ایڈیشن سرکاری طور پر شائع کر دیئے جائیں، جو ان جملہ محاسن ظاہری سے مزین ہوں جو افراد قلتِ ذرائع کے باعث پیدا نہ کر سکے، یا اشعار اقبال کے تراجم شائع کرا دیئے جائیں یا رسمی محفلیں منعقد کرنا شروع کر دی جائیں جو اقبالی مشاعروں کی حد سے آگے نہ بڑھیں۔ یا پھر ریڈیو یا دیگر سرکاری ذرائع سے کلام اقبال کو نشر کر دیا جائے۔ یہ یا اس قسم کے دیگر اقدامات نہ اقبال کی روح کے صحیح پیکر بن سکتے ہیں نہ ان کی بہترین یادگار قرار پا سکتے ہیں۔ ان کی حقیقی یادگار یہی ہے کہ استخواں کو چھوڑ کر مغز کو اجاگر کیا جائے۔ الفاظ کی حدود سے نکل کر معانی کی پر بہار وادیوں میں گلگشت کی جائے اور الفاظ اشعار کی بجائے روحِ اشعار کی تبلیغ کی جائے۔

اگر حکومت کے پیشِ نظر فی الواقع یہ مقصد ہے کہ اقبال کی تعلیماتِ اصلی کو پھیلایا جائے تو پامال راہوں سے ہٹ کر نئی اور صحیح راہوں پر چلنا چاہیے۔ اقبال کا سمجھنا اور سمجھانا ہر کس و ناکس کا کام نہیں جیسا کہ ہم نے لکھا ہے اقبال کا سرچشمۂ تخیل قرآن ہے، لہٰذا ان کا کلام قرآن ہی کی تفسیر ہے۔ چنانچہ کلامِ اقبال کی تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اصل یعنی قرآن کو کما حقہٗ سمجھا جائے۔ قرآن کا سمجھنا ہمارے ہاں ایک اور مشکل ہے۔ ہم نے اس گل خوشرنگ کے گرداگرد کانٹوں اور جھاڑیوں کی وہ گھنی باڑ لگا دی ہے کہ اس کا نظارہ امر دشوار ہو گیا ہے۔ جب تک یہ خارزار بالکلیہ صاف نہیں ہو جاتا ہم برای العین اس گل سرسبد کو جنت نگاہ نہیں بنا سکتے۔ لیکن یہ کام ان کے سپرد ہرگز نہیں کیا جا سکتا جو کانٹوں اور جھاڑیوں سے ہراساں ہو کر اس پھول کی عدم موجودگی کے قائل ہو جائیں۔ یا ان کانٹوں ہی کو پھول سمجھ کر اپنے آپ کو بھی

فریب دے لیں اور دوسروں کو بھی اس فریب میں مبتلا ہو جانے کی دعوت دیں۔

ہمارے ہاں ایسے اصحاب بالکل مفقود نہیں جو اقبال سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اقبال اکادمی ان حضرات کے سپرد کی جا سکتی ہے۔ وہی تعلیماتِ اقبال کو صحیح خطوط پر پھیلا سکیں گے۔ اقبال اکادمی اسی صورت میں مفیدِ ملت ثابت ہو سکتی ہے ورنہ ہر وہ صورت جو اس ضمن میں نکالی جائے گی ایک محفل اشعار سے زیادہ وقیع نہیں ہوگی۔ اگر محدود وطنی نقطۂ نظر سے بات کی جائے تو اقبال پاکستان کا بابائے قومیت Father of Nation ہے۔ لیکن یہ اندازِ گفتگو فکرِ اقبال کی تنقیص ہے۔ کیونکہ اقبال فکرِ اسلامی کے روحِ رواں ہیں۔ ان کے نام سے الہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل جدید کی جا سکتی ہے اور ملتِ اسلامیہ کی اسلامی خطوط پر تعمیرِ نو کی جا سکتی ہے۔ اقبال اکادمی بتدریج فکرِ اسلامی کی نمائندہ بن سکتی ہے اور حیاتِ اجتماعیہ میں حیاتِ نو کی ضامن۔ یہی اکادمی اُس فقہ جدید کو بھی مرتب کر سکتی ہے جس کا سرچشمہ قرآن ہو اور جس کی ترتیب کی خواہش اقبال کے قلبِ دردآگیں میں عمر بھر پہلو بدلتی رہی لیکن جو نامساعدتِ حالات کی وجہ سے مجسم پیکر میں سامنے نہ آ سکی۔

لہٰذا ہم حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اقبال اکادمی کی ترتیب و تشکیل کا فریضہ ان حضرات کے سپرد کرے جو اپنے علم و فضل کے لحاظ سے اس کے اہل ہیں اور اقبال کے منہج فکر یعنی قرآن کو خوب سمجھتے ہیں۔ ہم پورے زور سے درخواست کریں گے کہ اس اہم ملی ادارہ کو 'سرکاری' نہ بنا دیا جائے۔ ہم نے لفظ سرکاری کو واوین میں لکھا ہے۔ ادارہ بہرکیف سرکاری ہوگا لیکن ہماری مراد اس سے یہ ہے کہ اسے ویسا بے روح ادارہ نہ بننے دیا جائے جیسے عام طور پر سرکاری ادارے ہوتے ہیں، جو مشینی انداز سے چلتے ہیں مگر قلبِ انسانی کے ساتھ حرکت نہیں کرتے۔ اگر اسی طرح کا ادارہ قائم کر دیا گیا تو یہ بھی محض ایک میکانکی عمل بن کر رہ جائے گا، ایک مجسمۂ بے جان۔

اس ضمن میں ایک اقبال لائبریری کی اشد ضرورت ہے جو تشنگانِ علم کی سیرابی کا باعث ہو۔ پاکستان کے مرکز میں اعلیٰ قسم کی لائبریری انتہائی ضروری ہے اور اقبال اکادمی کے قیام کے ساتھ اس کی ضرورت اور اشد ہو جائے گی۔ لہٰذا ہماری درخواست ہے کہ

(۱) ایک مرکزی اقبال لائبریری کا قیام عمل میں لایا جائے جو انڈیا آفس (لندن) کی لائبریری کی جانشین ہو

اور جملہ علوم و فنون سے متعلق ممکن ذخیرہ کتب (قدیم و جدید) اس میں موجود ہو۔

۲) اقبال اکادمی کا اہتمام و انصرام شیدائیانِ اقبال میں سے ان کے سپرد کیا جائے جو قرآن پر عبور رکھتے ہوں اور تعلیماتِ اقبال کو جامعیت سے سمجھتے بھی ہوں اور سمجھا سکنے کی اہلیتِ تامہ بھی رکھتے ہوں۔

—— ایسی مکمل لائبریری کی موجودگی اور ایسی صحیح اکادمی کی نگرانی میں اقبال کا نورِ بصیرت شش جہات میں عام کیا جا سکتا ہے اور قرآن کا پیغام افرادِ ملت کے قلب کی گہرائیوں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس سے آگے بڑھئے تو یہ ادارہ تمام عالمِ اسلامی کی فکری تعمیر و تطہیر کا موجب بھی بن سکتا ہے، نہیں بلکہ وہ اقوامِ عالم کی امامت کا ضامن بھی ہو سکتا ہے۔ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء۔

یہ ہوگی اقبال اکادمی کے حسین خواب کی سچی حقیقی تعبیر۔ ورنہ سب افسانہ و فسوں!

ترانۂ پاکستان

طلوعِ اسلام کی جنوری۔ فروری کی اشاعت میں ہم نے اسد ملتانی صاحب کا ترانۂ پاکستان بدیں مقصد شائع کیا تھا کہ اربابِ نظر اس کے متعلق اپنی آراء سے مطلع فرمائیں۔ اس سلسلہ میں دو مراسلات درج ذیل ہیں۔ مدیر

قیامِ پاکستان سے متفرق مسائل ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ پاکستان کا ترانہ ملی کیا ہو۔ ہر آزاد ملک کا ایک نہ ایک ترانہ ضرور ہوتا ہے اور اب چونکہ پاکستان بھی آزاد ہو گیا ہے لہٰذا اس کا بھی دیگر ممالک کی طرح ایک ترانہ ہونا چاہیئے۔ یہ بظاہر ایک معقول بات ہے لیکن درحقیقت یہ خواہش ایک بنیادی غلطی کی غمازی کر رہی ہے۔ اس وقت کرۂ ارض قومی وحدتوں میں منقسم ہے۔ ہر قومی وحدت دوسری قومی وحدت سے جداگانہ اور الگ ہے اور اس کی جدوجہد کا مدار اس پر ہے کہ وہ سیاسی اور معاشی اعتبار سے دوسری وحدت سے زیادہ سے زیادہ بے نیاز ہو۔ یعنی وہ ممکن طور پر خود کفیل - Self sufficient ہو۔ اس خود کفالتی کے ہزار فوائد گنائے جانے کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ اس سے وہ انسانی اثاثہ بھی ٹکڑیوں میں بٹ گیا ہے جو نوعِ انسانی کے لئے مشترک تھا اور جو جغرافیائی حدود سے کبھی مختص نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً اثاثۂ تاریخ کو لیجئے۔ اب تاریخ، بجائے اس کے کہ وہ نوعِ انسان کے تجربۂ حیات کی حیثیت سے سامنے آئے، تاریخِ انگلستان، تاریخِ یونان، تاریخِ روس کی حیثیت سے مشہور ہوتی ہے۔ ہر قوم ان اجزائے مخصوصہ پر تفاخر کرتی ہے اور اپنی عظمت و برتری کے گیت گاتی ہے۔ اس ماضی کے ساتھ حال و استقبال کی خوش خیالیاں اور جمع ہو جاتی ہیں اور اس قومی اور وطنی تفاخر کا ایک پہلو قومی ترانہ کہلاتا ہے۔ قومی ترانہ شاندار ماضی اور خوش آئند مستقبل کے علاوہ حقیقی یا فرضی قومی مقاصد (مزعومہ) اور بعض صحیح یا غلط معاشی

خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ وطنیت (اور بعض ممالک مثلاً انگلستان وغیرہ کے نزدیک) شہنشاہیت یا بعض مقامات پر یہ دونوں، لات و منات ایسے مرکزی نقطے بن جاتے ہیں کہ قوموں کی حیات انہی کے گرد گھومتی ہے۔ چنانچہ قوموں کے ترانے اسی "فکر و نظر" کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

قومی ترانے عموماً سازوں پر گائے جاتے ہیں اور ان کے الفاظ کو صوتی یا موسیقی کے خطوط میں مرتسم کر لیا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ الفاظ کی بجائے سُر ہی کانوں سے مانوس ہو جاتی ہیں اور ان سُروں کو قومی ترانہ فرض کر لیا جاتا ہے۔ دیگر ممالک بالخصوص، ممالک مغرب میں مخصوص قومی زندگی کے پیشِ نظر ایسے مواقع شاذ و نادر ہی آتے ہیں کہ قومی ترانوں کو الفاظ کی صورت میں ادا کیا جائے۔ ان کے ہاں صرف ایسے مواقع آتے ہیں کہ ترانوں کو خطوطِ موسیقی کی مدد سے سازوں پر گایا جاتا ہے۔ یہ ترانے بین الاقوامی اجتماعات میں بھی رسماً گائے جاتے ہیں۔ ایسے اجتماعات میں ترانے کے حسن و قبح کا انحصار موسیقیت پر ہوتا ہے نہ کہ الفاظ و معانی پر۔ کیونکہ ساز پر گائے جانے کی صورت میں نہ الفاظ کی ضرورت باقی رہتی ہے نہ کہ معانی کی احتیاج۔ اور موسیقیت میں اس ضرورت کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ وہ بین الاقوامی اعتبار سے پسندیدہ اور جاذبِ گوش ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کا مطالبہ 'ترانہ' کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر اس کا مفہوم یہی ہے کہ دیگر اقوام و ممالک کی طرح پاکستان کا بھی ایک وطنی ترانہ ہو تو یہ بنیادی طور پر غلط مطالبہ ہے۔ پاکستان جن اصولوں کے تحت عمل میں لایا گیا ہے اور جن اساسات پر اس کا نظامِ حکومت استوار کرنے کے لئے نیک ارادے قلوب میں مضطرب ہیں وہ ہرگز ایسے ترانے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ قومی یا وطنی ترانہ ان اصولوں کی تردید ہے۔ پاکستان ہر چند ایک جغرافیائی وحدت ہے، لیکن قومیت اسلام، جغرافیہ کے اصولوں سے بلند تر ہے۔ اس کی اساس، فطرت انسانی پر ہے اور فطرت مقامی اور تنگ نظر ترانوں کی روادار نہیں ہو سکتی۔ اگر پاکستان بطور ایک جغرافیائی مملکت کے قائم کیا گیا ہے اور پاکستانی ایک جداگانہ قومیت، یعنی سیاست حاضرہ کی عام اصطلاح میں نیشن Nation ہے تو پھر قومی ترانے کا مطالبہ قابلِ فہم ہے۔ اس صورت میں اس کی قومیت کے گیت گائیے، اس کے امیر کے قصیدے پڑھیے، پہاڑوں کی عظمت کا تذکرہ کیجئے، دریاؤں کی روانیوں کی داستانیں بیان کیجئے، اور اس کے صحراؤں اور مرغزاروں کے مبالغہ آمیز چرچے کیجئے۔ لیکن

اگر اس کے برعکس پیشِ نہاد اسلام اور قرآن ہے تو لامحالہ اس نظریہ میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنی پڑیگی۔

اسلام کا ترانہ قومی اور وطنی نہیں ہوسکتا، وہ ہمہ گیر اور عالمگیر ہوگا۔ چونکہ اسلام کا ترانہ قومی نہیں ہوسکتا اور پاکستان اپنی اساس اسلام پر استوار کرنے کا دعویٰ لئے ہوئے ہے لہٰذا کوئی قومی ترانہ پاکستان کا ترانہ قرار نہیں پاسکتا۔ پاکستان کا ترانہ اسلامی (ملی) ترانہ ہوگا، جو قومی تفاخر اور وطنی تعلی سے مبرا ہوگا۔ وہ ان مقاصد کا حامل ہوگا جو انسان گیر ہوں گے۔ وہ اس مشن کی ترجمانی کرے گا جو کرۂ ارض پر انسان کے پیشِ نظر ہے۔ خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کی حیثیت سے اس پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں وہ انھیں نظر انداز نہیں کرسکتا، اور ہر وقت ان کی یاددہانی کرتا رہے گا۔ اس کا ترانہ ایسا ہی تذکرۂ جلیلہ ہوگا۔

اس پس منظر میں کوئی ترانہ ہماری ضرورت پوری نہیں کرسکتا الا ترانۂ ملی کہ جو خالقِ پاکستان علامہ اقبال مرحوم نے ملت کو دیا۔ تخلیقِ پاکستان کو آج تک اس سے بہتر اور صحیح انداز سے کوئی اور پیش نہیں کرسکا۔ یہ ترانہ پوری ملتِ اسلامیہ کا ترانہ ہوسکتا ہے۔ البتہ اسے مقامی رنگ دینے کے لئے۔ اور وہ بھی اس غرض سے کہ اس ترانہ میں جن مقاصد و عزائم کا ذکر ہے ان سے پاکستان پوری وابستگی کا اظہار کرتا ہے۔ یہ مناسب معلوم ہو کہ اسے پاکستانی بنالیا جائے یعنی لفظی اعتبار سے مناسب جگہوں پر ایسی تبدیلیاں کرلی جائیں جن سے یہ ترانۂ پاکستان کہلا سکے۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے کلام میں مناسب و موزوں تبدیلی کا حق ہر کسی کو نہیں دیا جاسکتا۔ یہ کام انہی کا ہوسکتا ہے جو ان اصولوں سے اتفاق کریں۔ یہ اتفاق ذہنی نہیں ہونا چاہیے بلکہ قلبی ہونا چاہیے۔ نیز ان کا پایہ شاعرانہ اعتبار سے عام سطح سے بلند ہو۔ میں ایسے ذمہ دار، خوش ذوق اور اہلِ حضرات سے درخواست کرونگا کہ وہ ان اشارات کے مطابق طبع آزمائی کریں۔ لیکن یہ ضرور خیال رہے کہ اقبال کے کلام کو اس بہانہ سے بازیچۂ اطفال نہ بنالیا جائے۔

ملی ترانہ کے لئے موسیقی کا مسئلہ اہم ہے خصوصیت سے اس ضرورت کے تحت کہ وہ بین الاقوامی اجتماعات میں گایا جائے گا۔ لیکن ہمیں اس ضمن میں چنداں کاوش کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اقبال کی شعریت میں موسیقیت اسی طرح مضمر ہوتی ہے جس طرح بربط کے تاروں میں نغمات۔

(رشید اختر)

(۲) طلوعِ اسلام ماہِ جنوری۔ فروری ۱۹۴۸ء میں جناب اسد ملتانی کا لکھا ہوا "ترانۂ پاکستان" شائع ہوا ہے۔ جناب نے اس کے متعلق اربابِ نظر سے اظہارِ آرا کے لئے فرمایا ہے۔ مجھے اہلِ نظر ہونے کا دعویٰ نہیں تاہم اپنی ناچیز رائے کے اظہار کی جرأت کرتا ہوں۔

میں اسد صاحب کے اس نظریہ سے کہ قومی ترانہ عام فہم اور آسان ہونا چاہئے صرف متفق ہی نہیں ہوں بلکہ اس کی پرزور تائید کرتا ہوں۔ قومی ترانہ ایک قوم کی اُن روایات اور Ideals کا آئینہ دار ہونا چاہئے جن کی وہ قوم حامل ہو۔ جب قومی ترانہ پڑھا جائے تو ہر پڑھنے اور سننے والے کی آنکھوں کے سامنے ان Ideals کا نقشہ پھر جائے اور اس کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو جائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر پڑھنے اور سننے والا اُس ترانے کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہو۔ اور یہ جب ہو سکتا ہے کہ ترانہ عام فہم زبان میں ہو۔

قومی ترانہ کے لئے ایک اور شرط یہ ہے کہ اُس کے ہر لفظ میں پائندگی پائی جائے۔ قومی ترانے کا تعلق قوم کی زندگی سے ہے۔ جب تک قوم زندہ ہے اس کا ترانہ کسی تغیر و تبدل یا صحت و درستی کا محتاج نہ ہو، اس لئے ترانہ یا اُس کا کوئی حصہ ایسا نہ ہو جس کا تعلق حال سے ہو اور کچھ مدت کے بعد بے معنی ہو کر رہ جائے۔

قومی ترانہ کے لئے ایک اور ضرورت یہ ہے کہ قوم کے ہر فرد کو جب وہ اُسے پڑھے یہ محسوس ہو کہ یہ اُس کا اپنا ترانہ ہے۔ یہ اُس کے اپنے خیالات کا نقشہ ہے۔ اُسے یہ محسوس نہ ہو کہ وہ کسی اور کے الفاظ اپنی زبان پر لا رہا ہے۔

اسد صاحب کے ترانہ کے پہلے شعر میں پائندگی نہیں۔ اس شعر میں حضرت قائدِ اعظم کی سلامتی کے لئے دعا ہے۔ اللہ انھیں ہمیشہ سلامت رکھے۔ لیکن قدرت کا قانون اٹل ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت موصوف کی حیاتِ مبارک کے بعد (حاکمِ بدہن) یہ شعر بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ ہاں اگر قائدِ اعظم کا لقب پائندہ ہوتا اور ہر امیرِ پاکستان کو دیا جا سکتا تو اس شعر میں ہرج نہیں تھا۔ جیسا کہ انگلستان کے قومی ترانہ "God save the King" میں 'King' سے مراد بادشاہِ وقت ہے چاہے کوئی ہو۔

اسی طرح آخری شعر میں شاید شاعر کا اشارہ پاکستان کے موجودہ دشمنوں کی طرف ہے۔ چنانچہ جب ان دشمنوں کی چالیں یا جب یہ دشمن خود ختم ہو جائیں گے تو یہ شعر غیر ضروری ہو جائے گا۔ اسی شعر میں ایک اور بات کو

میں قابلِ اعتراض سمجھتا ہوں۔ شاعر کو ترانہ میں اپنا تخلص استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ شاعر اپنا تخلص کسی وجہ سے بھی استعمال کریں ترانہ کے اشعار میں تخلص سے شاعر کا اشعار پر حقِ ملکیت ظاہر ہوتا ہے۔ قومی ترانہ قوم کا ترانہ ہوتا ہے اور وہ کسی فردِ واحد کی ملکیت نہیں ہو سکتا۔

جس شاعر کا لکھا ہوا ترانہ بالآخر پاکستان کا قومی ترانہ قرار پائے گا یقیناً اس شاعر کا نام پاکستان کی تاریخ کے پہلے باب میں لکھا جائے گا۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیے؟

"ترانۂ پاکستان" کے باقی سب اشعار نہایت حسین ہیں اور واقعی قومی ترانہ میں شامل ہونے کے قابل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کے مسلمانوں کو اس کام کے لئے چُنا ہے کہ وہ بھٹکی ہوئی دنیا کو پھر ایک بار وہی پیغام دیں جسے سرورِ کائناتؐ نے تیرہ سو سال پہلے دیا تھا اور جسے کافی عرصہ ہوا دنیا بھول چکی ہے۔ اس لئے موزوں ہوگا کہ پاکستان کا قومی ترانہ اہلِ پاکستان کو یہ بھی یاد دلائے کہ اُسے دنیا کو کیا پیغام دینا ہے۔ اس موضوع پر ایک آدھ شعر ضرور ترانہ میں شامل ہونا چاہیے۔

(میجر) محمد نواز ملک

پاکستانی اچھوت

چیف کورٹ (کراچی) کی عمارت میں مرکزی حکومت کے کچھ دفاتر ہیں۔ ان دفاتر میں ایک بڑے دروازہ کے باہر ایک بورڈ آویزاں ہے جس پر لکھا ہے۔

یہ راستہ صرف افسران کے لئے ہے

یعنی "اچھوت بابوؤں" کو اس مقدس دروازہ سے گذرنے کی اجازت نہیں۔ انگریز کی دفتری حکومت میں افسر اپنے آپ کو ایک جداگانہ "برادری" سمجھا کرتے تھے جس کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ ہر غیر افسر کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ ہم نے سمجھا تھا کہ انگریز کے چلے جانے سے یہ لعنتیں بھی دور ہو گئی ہوں گی لیکن معلوم ہوا کہ رسی کے جلنے کے بعد بھی اس کے بل قائم رہتے ہیں!

حیرت ہے کہ انسان کب تک ان غیر انسانی حرکات کو جاری رکھیگا۔ اور اس سے بھی بڑی حیرت یہ کہ انسان ان حرکات کو کب تک برداشت کئے جائے گا۔

مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش امذر!!

طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

سابقہ اشاعت میں 'محاسبہ نفس' کے تحت ہم نے ختمِ کلام کے طور پر اس بدیہی حقیقت پر زور دیا تھا کہ نفسیاتی طور پر قوم کا اعتماد استحکامِ حکومت کے لئے ضروری چیز ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ بعض راز ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں عوام پر افشا نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس قسم کی پردہ داری حالتِ جنگ تک محدود ہوتی ہے۔ جنگ یا اس قسم کے واقعات کے بعد یہ راز، راز نہیں رہتے۔ اُس وقت ان مصالح کا اخفا قوم کے تحت الشعور میں عدم اعتماد کی ایک پھانس بن کر کھٹکتا رہتا ہے اور یہی پھانس بالآخر اہم انقلابات کا موجب بن جاتی ہے۔

پاکستانی پارلیمان میں پہلے پاکستانی بجٹ پر بحث کا جواب دیتے ہوئے پاکستان کے پہلے وزیرِ خزانہ نے پہلی مرتبہ ایک ایسے راز کی طرف اشارہ کیا۔ پاکستان کی مالی تنگدستی کا ذکر کرتے ہوئے جناب غلام محمد نے کہا:۔

> پاکستان جس مالی بحران سے دوچار ہوا ہے، تمام تاریخِ انسانی میں کوئی کابینہ، کوئی حکومت قیام کے فوراً بعد ایسے بحران سے دوچار نہیں ہوئی۔ . . . . . قوم کو معلوم نہیں کہ ۱۵ اگست کے بعد کابینہ اور حکومت کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

ہم نے قوم اور حکومت کے مابین جس خلا کا ذکر کیا تھا وزیرِ خزانہ نے اسے تسلیم کیا ہے۔ آپ نے اس اعتراف کو بطریقِ استدلال پیش کیا ہے اور مخالفین کو اس سے لاجواب کرنا چاہا ہے حالانکہ ضرورت مخالفین کی زبان بند کرنے کی نہیں بلکہ موافقین کے اطمینانِ قلب کی ہے۔

خلا کے ضمن میں اولیں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خلا موجود کیوں ہے، یعنی اس کی علت کیا ہے؟ ہماری سیاسی تاریخ کے قریب و بعید سے اس سوال کا مکمل جواب مہیا کرتی ہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پیشتر ہم

انگریز کے غلام تھے جس نے ڈیڑھ سو دو سو سال تک اپنے قومی مصالح کے ماتحت ہم پر حکومت کی۔ سیاسی استیلا اور اقتصادی استحصال بالجبر، استعمار و استبداد کے لازمی نتائج ہوتے ہیں۔ اجنبی حکومتیں اپنے مخصوص وطنی مصالح کو پیشِ نظر رکھتی ہیں اور ان سیاسی محرکات پر کاروبارِ نظامِ حکومت قائم کرتی ہیں جو انسانوں کو وادیٔ انسانیت سے نکال کر حیوانوں کے گلے میں دھکیل دیتے ہیں اور انھیں اشرف المخلوقات کے مقامِ بلند سے گرا کر دیگر "مسخراتِ کائنات" کے مقامِ پست پر لے آتے ہیں۔ انسان بالفطرت آزاد واقع ہوا ہے۔ آزادی اس کی فطرتِ صحیحہ کا خاصہ ہے۔ وہ جب غلام بنتا ہے اور غلامی پر رضامند و قانع ہو جاتا ہے تو اس کی فطرت مسخ ہو جاتی ہے۔ غلامی اور مسخِ فطرت لازم و ملزوم ہیں۔ غلامی مسخِ فطرت میں مدد ہوتی ہے اور مسخِ فطرت غلامی کو استحکام بخشتا ہے۔ استبدادی قوت اسی دَوری تعلیل (Circuler Causation) سے فائدہ اٹھاتی ہے اور اپنے خونی پنجے غلام قوم کی رگِ جان میں اور مضبوطی سے پیوست کرتی جاتی ہے۔

جیسے انسان بالفطرت آزاد ہے اسی طرح وہ مدنی الطبع Gregarcous واقع ہوا ہے۔ مدنیت میں انسان انسان سے اشتراکِ عمل کرتا ہے اور اپنی بعض مدنی۔ اجتماعی۔ ذمہ داریاں تقسیمِ کار کے طور پر اپنوں میں سے بعض کے سپرد کر دیتا ہے (اولی الامر منکم)۔ یہی مدنیت آزمایش و تجربہ کی ان گنت وادیوں سے گذرتی، ارتقائی مراحل طے کرتی منظم اور جمہوری حکومت میں شکل پذیر ہوئی ہے۔ **منظم اور جمہوری!** اس لئے کہ نظم و جمہوریت مدنیت کی یقینی بنیادیں ہیں۔ انسانی اجتماع و مدنیت "نظم و جمہوریت" کے بغیر جسدِ بیہودہ اور جسدِ بے روح ہے۔ انسان جب تک اپنے گرد و پیش نظم و ضبط نہیں پیدا کر لیتا وہ اطمینان و دلجمعی سے اظہارِ ذات و تسخیرِ کائنات کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ نظم و ضبط کے ساتھ ساتھ اسے اس اعتماد کی بھی اشد ضرورت ہے کہ اس نے اپنی آزادی پر جو اجتماعی پابندیاں لگائی ہیں وہ اسی کے مفاد کے لئے ہیں نہ کہ ان افرادِ منتخبہ کے شخصی تفوق کے لئے، جو اجتماعی حقوق و فرائض کے امین بنائے گئے تھے لیکن مرورِ زمانہ اور نشہ قوت نے انھیں اجتماعی خائن بنا دیا۔ جنھیں مشترک امور مہم کی بجا آوری کے لئے منتخب کیا گیا تھا اور وہ حاکم بن گئے۔ جنھیں متعلقہ گروہِ انسانی نے بغرض سہولتِ کار چند ذمہ داریاں تفویض کی تھیں اور اس گروہ کو قومی خدمت کی سعادت بخشی تھی، مگر انھیں ہوسِ جوئیوں نے اندھا کر دیا اور وہ مخدوم بن بیٹھے۔ وہ مخدوم کیا بنے گروہِ انسانی کے جسم و ذہن کے مالک

بن بیٹھے۔ یہ انسان خمار، انسانی قابوس تاریخ انسانی کے صفحے صفحے پر ناچتے دکھائی دیتے ہیں۔ تڑپتی لاشیں ان کے سازِ استبداد کی لرزاں تاریں ہیں۔ اور پامال و مظلوم انسانوں کی آہیں، چیخیں، کراہیں ان کے آہنگِ رقص کا زیر و بم۔

یہ طائفہ استبداد، قیاصرہ و فراعنہ کی شکل میں آیا یا احبار و رہبان کے لباس میں، اس نے انسان کو نہ محض جسمانی طور پر روندا بلکہ ذہنی طور پر بھی اسے ماؤف کیا۔ جسمانی خدمت تو بالآخر جسم سے ہی متعلق تھی اس کا اثر، بیشتر جسمانی اور کمتر ذہنی، زائل کیا جا سکتا تھا اور انسان کو پھر سے اس کے مقام پر فائز کیا جا سکتا تھا لیکن ذہنی و فکری استیلا نے انسان کو انسانوں کے درجے سے گرا دیا اور حیوانات و جمادات تک پہنچا دیا۔ اب ہر چند وہ استبداد ملوکانہ بہ اشتداد دیرینہ موجود نہیں اور انسان ایک حد تک اس قابوسِ ذہنی کے چنگل سے نجات پا چکا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ نجات ہنوز سطحی ہے۔ یہ بالائے آب نرم و نازک ہوا کی پیدا کردہ خفیف لرزشیں ہیں۔ زیرِ سطح وہی سکوت و جمود ہے۔ انسان کا تحت الشعور ہنوز اسی تاریکی کی آماجگاہ ہے۔ حریت، مساوات، اخوت کے نعرے لگانے والے ابھی ان کے معانی سے کماحقہٗ آشنا نہیں ہوئے۔ ہنوز یہ سربستہ راز ہیں — انسانی تحت الشعور کی ظلمت میں حریتِ فکر کا آفتاب ابھی ضوفگن نہیں ہوا۔ یہ تاریک خانہ ابھی تک ذہنی چمگادڑوں سے معمور ہے۔ انسانی فکر کا شہباز ان فضاؤں اور وادیوں میں پرفشاں نہیں ہوا۔

انگریز ہماری شب غلامی میں انہی چمگادڑوں سے کام لیتا رہا۔ یہ تو خیر قابلِ فہم تھا۔ لیکن اب؟ اب تو ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہم نور کی وادی میں ہیں! دولتِ خداداد پاکستان! ملتِ اسلامیہ ہند یہ کی دو سالہ جدوجہد کا ثمرہ، پاکستان! شرعی نظامِ حکومت کی تجربہ گاہ، پاکستان! اب ہم آزاد ہیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء پاکستان کا یوم پیدائش اور ملت کا یومِ آزادی ہے۔ اب ہماری اپنی حکومت ہے، استبداد و جور کی کارفرمائی نہیں رہی۔ یہی قائدِ اعظم ہماری محبوب و احد نمائندہ مسلم لیگ کے صدر، ہمارے گورنر جنرل ہیں۔ یہی لیاقت علی خاں، اسی مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری، ہمارے وزیرِ اعظم ہیں۔ پاکستان کی حکومت اسی مسلم لیگ کی مرتب کردہ ہے۔ اس مسلم لیگ کی حکومت جسے ہم واحد نمائندہ جماعت سمجھتے تھے نہ محض خود سمجھتے تھے بلکہ دوسروں سے منواتے تھے۔ ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک انگریز اور ہندو سے جب بھی گفتگوئے مصالحت کا موقع آیا ہم نے اولیں مطالبہ

اس کی بنیادی وجہ صدیوں کی عادت ہے جس کا ہم نے ابھی تذکرہ کیا ہے۔ تعجب ہے کہ اس کا ازالہ کرنے کی کسی نے بھی کوشش نہیں کی۔ آج ہمارے وزیرِ خزانہ فخریہ یہ فرما رہے ہیں کہ قوم کو معلوم نہیں کہ حکومت — یعنی نصف درجن اشخاص کی جماعت — کن کن مشکلات سے دوچار رہی ہے۔ حضرت! آپ نے قوم کو یہ بتانے کی کوشش کیوں نہیں فرمائی کہ آپ کی مشکلات کیا ہیں؟ کیا جن عوام کے خون اور پسینے پر آپ کے قصرِ حکومت کی بنیادیں قائم ہیں ان کا اتنا بھی حق نہیں کہ آپ انھیں بتائیں کہ آپ کی ضروریات کیا ہیں؟ کیوں ہیں؟ اور عوام آپ کے لئے کیوں مزید قربانیاں دیں؟ کیا یہ قربانی کے بکرے اتنا حق بھی نہیں رکھتے کہ انھیں معلوم ہو کہ ان کے خون کی ضرورت کیوں پڑ گئی ہے؟

ضمیرِ کائنات میں پہلو بدلنے والی تبدیلیاں اب پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اب وہ وقت نہیں رہا کہ قوم کو خاموش اور گونگا مجمع سمجھ لیا جائے یا انھیں بدستور اسی وادیٔ سکوت — اور جمود — میں رکھا جائے۔ قیامِ پاکستان سے پیشتر ہم ایسی منزل میں تھے کہ ہمیں اپنی جداگانہ حیثیت منوانے کے لئے یک زبان اور ہم آواز ہونے کی ضرورت تھی۔ اس وقت سیاسی عوامل کا تقاضا تھا کہ عوام اسی پر صاد کر دیں جو کچھ قائد نے کہدیا ہے۔ اس وقت ہندو کے مقابلہ میں ہمیں یہ دکھانا تھا کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ اس وقت حریتِ فکر ہمارے مفادِ ملت کے منافی تھی، کیونکہ اس کا نتیجہ تشتت ہوتا جس سے ہمارے مطالبہ کو لامحالہ نقصان پہنچتا اور ہم منزلِ پاکستان کے قریب نہ ہو سکتے۔ تقسیمِ ہند سے پیشتر کی سیاست پر نگاہ دوڑائی جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی سیاست صرف اس قدر تھی کہ قائداعظم بطور ایک وکیل مقدمہ لڑ رہے تھے اور قوم وقتاً فوقتاً یہ یاددہانی کرا دیا کرتی تھی کہ ہم نے اس وکیل بلکہ اسی وکیل کو مختار نامہ دے رکھا ہے۔ چنانچہ گذشتہ دس سال میں عمومی حیثیت سے ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے 'فکر' کی نوعیت یہ رہی کہ قائداعظم نے ایک مقام پر ایک رائے کا اظہار کیا اور جگہ جگہ جلسے منعقد کر کے اس فیصلہ پر صاد کر دیا گیا۔ چونکہ عمومی ضرورت اس قسم کی تھی، اس لئے بقول اکبر مرحوم قومی زندگی کے آثار اخبارات تک محدود رہے اور قوم کی فکری صلاحیتیں خوابیدہ ہی رہیں۔ رائے عامہ، یعنی آئین و سیاست کا وہ حربہ کہ حکومتوں کی شکست و ریخت اسی پر منحصر ہے، ہمارے ہاں مفقود رہی۔ یہ فکری استیلا Regimentation of thought یا Power thought

ایک حد تک ناگزیر تھا کیونکہ۔ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے اس سے مقدمہ کی روئداد پر زد پڑنے کا احتمال تھا۔ یہ اتفاق وجمعیت حریف پر اثر کئے بغیر نہ رہ سکے اور بالآخر اسے ہمارے مطالبہ کی بے پناہی کے سامنے جھکنا پڑا۔

لیکن اب حالات دگرگوں ہیں۔ قیام پاکستان تک کی جدوجہد مختلف تھی۔ اس کے حربے ناکارہ ہو چکے ہیں۔ اب محاذ بدل گیا ہے۔ مشکلات کی نوعیت اور ہے۔ وقت کے تقاضے اور ہیں۔ اب ہمیں نئے حربوں کی ضرورت ہے۔ اب چند گنتی کے افراد کو ہرگز ہرگز یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ ملت کو افیون کھلا کر سلائے رکھیں اور خود ان کی طرف سے سوچیں اور کریں۔ اب قوم ان کی موکل نہیں، نہ وہ وکیل ہیں۔ اب وہ صاحبِ اقتدار و اختیار اس لئے نہیں کہ کل تک وہ مسلم لیگ کے عہدے دار تھے بلکہ اس لئے کہ قوم نے نظامِ حکومت کو متشکل اور نافذ کرنے کی ذمہ داری ان کے سپرد کر دی ہے۔ یہ ذمہ داری اس وقت تک ان کے پاس رہے گی جب تک کہ ملت کو یہ اعتماد ہے کہ وہ اسے بطریقِ احسن بلکہ ملت کی منشا اور اس کے مفاد کے مطابق نباہ رہے ہیں۔ اب قوم ان کی محاسب ہے اور وہ قوم کے سامنے جواب دہ ہیں۔ اب یہ حالت نہیں کہ وہ قوم کو رازدار نہ بنائیں اور ان ملی امور کی نگہداشت اپنا خصوصی اجارہ سمجھیں جن کی سرانجام دہی ملت نے ان کے سپرد کی ہے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے ملت اور نمائندگان ملت (یعنی عہدہ دارانِ حکومت) کے مابین مغائرت خلافِ جمہوریت ہے اور نظام و نفاذِ نظام کے لئے مہلک۔ ہمیں افسوس ہے کہ حکومت نے اس خلا کو پُر کرنے کی مطلقاً کوشش نہیں کی۔ ۱۵ اگست کے بعد ملت پر قتل و غارت کی قیامتیں گزریں۔ لاکھوں موت کے گھاٹ اتارے گئے، لاکھوں بے خانماں ہوئے۔ چشمِ فلک نے ایسی لرزہ خیز سفاکی اس سے پہلے نہیں دیکھی ہوگی۔ اگر بغرضِ استدلال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہمارے قائدین اس باب میں مجبور تھے تو بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس عظیم الشان ابتلاء اور اس کے تاثرات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حکومت نے جو کچھ کیا یا جو کچھ وہ اب کر رہی ہے یا جو اس کے آئندہ عزائم ہیں وہ کیوں صیغۂ راز میں رکھے جاتے ہیں؟ کیا اس لئے کہ استعماری قوت کی طرح کہ جس کے جانشین یہ لوگ بنے ہیں قوم کو بدستور اعتماد کے دائرے سے خارج رکھا جائے؟ اسے بدستور شودر یا اچھوت سمجھا جائے کہ اگر وہ پاس آئے تو یہ "برہمن" بھرشٹ ہو جائیں لیکن ان کی خدمت ان ہی لوگوں کے سپرد ہو؟

ہم اربابِ حکومت پر اس حقیقت کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ جہاں تک ہم نبضِ ملت کا احساس کر رہے ہیں، انھیں ملت کا اعتماد حاصل نہیں۔ یہ عدم اعتماد اگر کسی صحیح ترقی یافتہ جمہوری ملک میں پائی جاتی تو حکومت کب کی شکست کھا چکی ہوتی۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بعض معاملاتِ حکومت کو راز میں رکھا جانا چاہیئے۔ یہ درست ہے کہ ہر معاملہ میں عوام کو راز دار نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن جن معاملات میں رازداری سے کام لیا جاتا ہے وہاں تقاضائے وقت یہی ہوتا ہے اور ملت پر عدم اعتماد کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس وقت ملت حکومت کو 'اپنی' نہیں سمجھتی، وہ اسے بدستور اجنبی اور غیر سمجھ رہی ہے۔ حکومت نے یہ غلط فہمی رفع کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اربابِ حکومت مشینوں کی طرح پہلے سے طے شدہ آئین وضوابط کے مطابق حکومت کر رہے ہیں اور بس۔ وہ خود اس احساس وشعور سے تہی معلوم ہوتے ہیں کہ اب حکومت 'اپنی' ہے۔ بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابھی تک اپنے آپ کو کسی 'اور' کا ملازم متصور کرتے ہیں۔ کاش اس 'اور' سے مراد ملت ہوتی!

فسطائیت کی آمرانہ حکومت اور جمہوریت کے نظامِ جہانبانی میں فرق ہی یہ ہوتا ہے کہ اول الذکر میں حاکم اور محکوم میں سخت مغائرت ہوتی ہے جو ان دونوں کے درمیان آہنی دیوار بن کر حائل ہوتی ہے اور محکوم "بلا شریکِ حکم" احکام کی اطاعت کرتے ہیں۔ لیکن ثانی الذکر میں حاکم اور محکوم کا فرق نہیں ہوتا اور محکوم اپنے آپ کو محکوم نہیں بلکہ "شریکِ حکم" سمجھتا ہے اور ایسی صورت میں ممکن ہے جبکہ قوم کو مصالحِ حکومت کا راز دار بنا کر اس کا اعتماد حاصل کر لیا جائے۔ لہٰذا اگر آپ کے دعویٰ جمہوریت مبنی برحقیقت ہیں تو اس امر کی کوشش کیجئے کہ قوم اپنے آپ کو شریکِ حکومت سمجھے۔ اس میں پاکستان کے استحکام وارتقا کا راز پوشیدہ ہے۔

حکومت اور قوم کے مابین ایک اہم رابطہ مجلسِ مقننہ کا ہے لیکن پاکستان کی مجلس دستور ساز جو اب مرکزی مقننہ کی حیثیت بھی اختیار کر گئی ہے، قیامِ پاکستان سے پیشتر منتخب ہوئی تھی۔ اس کے علیٰ حالہ قائم رہنے سے عوام یوں محسوس کرتے ہیں کہ یہ از غیب ان پر مسلط ہو گئی ہے اور ان کی منتخب کردہ نہیں۔ یوں بھی حالات نے انتخابی تبدیلیوں کو ناگزیر کر دیا ہے (مجلسِ مذکورہ نے حالیہ نشست میں اس کے لئے

مناسب اقدام کر بھی دیا ہے) ۔ یہ مجلس "ترکیب" کے علاوہ کارروائی کے اعتبار سے بھی بے جان سی نظر آنے لگی ہے۔ ایک تو یہ اتنے طویل عرصہ کے بعد کروٹ لیتی ہے کہ اسے مردہ متصور کرنے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا اور جب اس کی نشست منعقد ہوتی ہے تو وہ اتنی مختصر اور رسمی ہوتی ہے کہ اس کی کارگزاری سے ناامیدی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تدوینِ آئین کا معاملہ ابھی تک معلق ہے اور عوام یوں محسوس کرنے لگے ہیں کہ شاید اسے نبٹایا ہی نہیں جا سکتا یا ارکانِ مجلس اس کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اس ادارہ کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق بنا دیا جائے اور اسے زندہ اور فعال ادارہ کی حیثیت سے چلایا جائے تو حکومت اور ملت کے مابین ایک خاطر خواہ رابطے کا اجار ہو سکتا ہے اور باہمی اعتماد کا نہایت عمدہ ذریعہ۔ اس کے علاوہ اطلاعات اور ریڈیو کے محکمے فرسودہ، دقیانوسی اور بے منزل راہوں پر چلنے کی بجائے اگر صحیح خطوط پر کام کریں اور وہ نبضِ ملت کے ساتھ حرکت کریں تو خاطر خواہ نتائج پیدا ہو سکیں گے۔ قوم بدل و جان حکومت کے ساتھ ہو گی۔ ساتھ کیا ہو گی قوم اور حکومت مرادف ہو جائیں گے۔ یہ "قران" ہو گیا تو اس کے نتائج دنیا دیکھے گی۔ یہ اس "عالمِ نو" کی تمہید ہو گی جو ابھی بمدۂ تقدیر میں ہے۔